

# مابدولرت

(آپ بیتی)

شوکت تھانوی



# مابدولت

شوکت تھانوی

ادارہ فروغِ اردو دہلی

قیمت تین روپے چار آنے

(مطبوعہ حیدر پریس، پھیوان دہلی)

## کچا چٹھا

نہیں ہمارا گاندھی ہوں، اور نہ مجھے تلاش حق نے اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر رخ کو اس قدر سچائی کے ساتھ پیش کروں کہ وہی سچ میری شناخت بن کر میرے سامنے آجائے۔ پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے سچ بولنے کی نہایت خطرناک کوشش کی ہے اور دراصل اپنے ان حالات کو پیش کرنا ہی ایک قسم کا اقدام خود کشی ہے ہمارا گاندھی کا کیا ہے، وہ تو بچپن سے ہمارا چلے آ رہے ہیں، بڑے سے بڑا جرم انہوں نے یہ کیا ہے کہ گوشت کھایا یا کسی دوست کے بہکانے سے کسی بیسول کے یہاں چلے گئے، اور وہاں سے صحت نکل آئے، لیکن یہ خاکسار نہ تو کبھی ہمتا تھا، نہ اب ہے نہ آئندہ ہو سکتا ہے دوسرے ہمارا گاندھی کی طرح اپنے حالات زندگی پر ہچا رہے ہو جانے کے بعد بھی نہیں بلکہ اس اصول کے خلاف کی عین حالت میں لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں، طرح طرح کے اندیشے سامنے ہیں دوست خفا ہو جائیں گے، لوگ پست رائے قائم کر لیں گے، بزرگ نالائق سمجھنے لگیں گے، اور سب سے بڑھ کر بیوی..... ذرا ٹھہر جائیے مجھے اس تصور سے بھر اختلاف ہونے لگا، بات یہ ہے کہ بیوی لاکھ ہمدرد ہمراز سہی مگر غفلت مند آدمی

ہر بات تو بیوی سے کہا نہیں کرتے اور نہ دراصل بیوی سے ہر بات کہنے کے بعد ایک شوہر کو وہ عافیت حاصل ہو سکتی ہے جو اپنی تاریکیوں پر روشنی نہ ڈالنے کی صورت ہو حاصل رہتی ہے۔ بیوی کو ہماری جتنی خامیوں کا علم ہے وہی کیا کم ہے۔

کہ اب ہم اس موت کو اور بھی قریب کرنے کے لئے مارے شیخی کے اپنے کو بالکل بے نقاب بنا کر ان کے سامنے پیش کر دیں، مگر جب کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ بھی ایک قسم کا اقدام خود کشی ہے۔ میں پوری کوشش ہی کروں گا کہ جہاں تک ہو سکے سچ بولوں، البتہ شبہ اس سلسلہ میں یوں ہے کہ اگر ہاتھ کاڑھی کی طرح میری زندگی بھی معصوم ہوتی تو میں جھوٹ موٹ بھی جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرتا۔ مگر یہاں تو سوائے جرائم کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔ طرح طرح کی بد اعمالیوں بے عنوانیوں اور اخلاق سوزیوں کے سوا اور اس ہیچمدان کی زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ مگر جو چیز ہم سے یہ حالات لکھوا رہی ہے اس کا نام ہے "خون خدا" اپنی زندگی پر جب کبھی خود اپنی نظر پڑ جاتی ہے اور سنجیدگی سے غور کرنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ تو گھنٹوں غور کیا کرتے ہیں کہ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ ہم سے وہ سب کچھ کیوں کر دہرایا جائے گا جو ہم کر چکے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ خود ہی اقبالِ مجرم بن جائیں۔ کیا عجب کہ یہی اعتراف رحمت کو جوش میں لے آئے وہاں تو خیر رحمت پر بھروسہ ہے مگر گھر میں کیا ہوگا۔ بیگم صاحبہ کے سلسلہ میں تو رحمت کا کوئی سوال ہی نہیں۔ عفو کا کوئی امکان ہی نہیں۔ یوں ہی اپنے شوہر سے بہت زیادہ خوش عقیدہ ہیں اور اب تو وہ غالباً اس خاکسار کو اس قابل سمجھنے لگیں گی کہ پولس کے حوالے کر دیں یا گھر سے نکال دیں یا کم سے کم ہمیشہ کے لئے سچ بولنے کی اس پاداش



میں قابل اعتبار سمجھنے لگیں۔

سچ بولنا دنیا میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ تمام دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ جائیے مصیبت میں آپ ان ہی کو مبتلا پائیں گے جو سچ بولنے والے گزرے ہیں۔ قانون ان ہی کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے، جھوٹ بولتے رہتے، دھوکے دیتے رہتے۔ بے ایمانیا کئے جاتے۔ مگر سب کو مطمئن رکھتے کہ آپ نے یہ کچھ نہیں کیا ہے۔ سب مطمئن رہیں گے۔ زندگی بھر کی ایمان داری کے بعد ایک بے ایمانی کر لیجئے مقدمہ چل جائے گا۔ سزا ہو جائے گی چور چوری کر کے بھاگ جاتا ہے اور شاہ بنا پھرتا ہے۔ سا ہو کار کے حساب میں ذرا سی غلطی ہو جاتی ہے۔ خیانت میں پکڑا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اگر دنیا کے اصول کو دیکھا جائے تو اس سے بڑھ کر اور حماقت کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کو پیش کر دیں۔ اب یہ کہنے والا کوئی بھی نہ ہوگا کہ خدا نے اس کو سچ بولنے کی توفیق عطا کی۔

کوئی کہے گا "سن لیا آپ نے یہ جو آپ کے شوکت تھانوی ہیں اعلیٰ درجہ کے جواہری واقع ہوئے ہیں۔"

کسی طرف سے آواز بلند ہوگی "بد معاشیوں کے سوا اور کچھ کیا ہی نہیں۔" کوئی صاحب فرمائیں گے "بے حیائی اور ڈھٹائی ملاحظہ ہو کہ کس صفائی سے اپنا اعمان پیش کیا ہے۔"

کوئی بڑے شاعرانہ انداز سے کہے گا "چہ دلا درست وز دے کہ بکف چراغ دارد۔"

اور بیوی اپنے پھولے ہوئے رخ روشن پر اپنے آنسوؤں کا انتظار کرتے

ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہیں گی۔ داری قسمت شکر ہے خداوند تیرا۔  
یہ سب سچ بولنے کے سلسلہ میں ہو گا۔ سچ بولنے کی کوشش نہ کرنے تو کیسے اچھے  
ہستے لکھنے والے نہایت ادب سے مولانا شوکت تھانویؒ لکھ رہے تھے  
حالانکہ مولانا نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔ زندگی میں دس پانچ ہی سالم روزے  
رکھے ہوں گے چہرے پر سوائے ایک سال کے کبھی وارٹھی نہیں رہی۔ اور نہ  
سنجیدگی سے کبھی کوئی کام ایسا کیا جو خالص خدا کے لئے کہا جاسکے۔ بزرگ حضرت  
شوکت تھانوی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کو معلوم نہیں ہے کہ یہ شوکت تھانوی پڑے  
حضرت ہیں۔ بیوی بہت زیادہ تو خیر خوش نہیں ہیں۔ اس لئے جو کچھ ان کے  
عالم میں ہے۔ اسی کو وہ بد نصیبی کے لئے کافی سمجھتی ہیں۔ مگر ان کا شوہر یہ سچ  
نہ بولتا تو وہ اپنے کو اتنا ہی بد نصیب سمجھتی رہتیں اور اب تو ان میں پاری  
کی بد بختیوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہے گا۔ اس لئے کہ ان کے شوہر میں اور توبہ  
عیب تھے ہی یہ کمبخت تو چور کے علاوہ سپینہ زور بھی نکلا۔ بے شرمی کی حد کر دی  
سب کچھ لکھ کر چھاپ دیا کہ بوی جلتی ہو تو جی کھول کر جلو تم ہمارا کہہ سکتی  
ہو ہم نے جو کچھ کیا خوب ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ یہ کیا یہ کیا اور یہ کیا۔

ان تمام حالات کے ماتحت سچ بولنے کی جرأت کرنا خود کشی نہیں تو اور کیا  
ہے۔ گاندھی جی کو تلاش حق تھی اور یہاں تلاش شامت ہے۔ ان کا کیا ہے۔ وہ تو جہاں تھے  
اپنے حالات لکھ کر اس سے بھی کچھ ادب نہ ہو گئے مگر ہم دنیا کی نظروں  
سے اپنے کو گرانے کے لئے اپنے عقیدتمندوں میں بدعت بدگی پھیلانے کیلئے  
دوستوں سے دشمنی مول لینے کے لئے اور دشمنوں کی دشمنی کم بنانے کے لئے یہ تمام

سامان کر رہے ہیں اپنے عزیز شرمائیں گے کہ لاجوں ولاقوۃ اس تنگ خاندان نے تو ناک ہی کاٹ لی۔ احباب بھپتائیں گے کہ تو بہ ہے اس کمبخت سے کیوں میل جول رکھا۔ ہمسائے لڑکچر سے دھسپی رکھنے والے بد دل ہوں گے کہ یہ تو بڑا تھوڑا کلاس انسان ثابت ہوا۔

یہ سب کچھ گوارا ہے۔ مگر اب زندگی کا اعتبار روز بروز اٹھتا جاتا ہے کنپٹی کے اوپر اور ناک کے عین نیچے کچھ بال سفید ہو چکے ہیں۔ قلب کی شکایت روز بروز فروں ترقی پر ہے۔ عینک کا نمبر بڑھتا جاتا ہے۔ یہ سب آثار ہیں وہاں مٹی کے اور حال یہ ہے اب تک کہ دنیا کسی طرح چھوڑتی ہی نہیں، نہ روزے کے، نہ نماز کے، سوائے مصیبت کے کسی وقت خدا کا نام بھی زبان پر نہیں آتا۔ اب اگر خدا نے یہ توفیق دی ہے کہ کم سے کم اپنی لغزشوں کا اعتراف ہی کر لیں تو اس توفیق سے دنیا والوں کے ڈر کے ماتھے ہم آخر کیوں باز رہ جائیں۔ ہم اگر سچ بولنے کے بعد قابلِ نفرت ثابت ہوتے ہیں۔ تو یہ تصور ہمارا نہیں بلکہ اس سچ کا ہو گا جس سے اب تک بچنے کی ہم نے ایمان داری کے ساتھ پوری کوشش کی مگر آخر کار ۶۔ دہرے گئے دلِ خانہ خراب کے بدلے

ہماری آپ بیتی کا یہ پہلا حصہ ہے جو اپنی زندگی کے اس دور پر ختم ہو جاتا ہے جس کا تعلق اخبار نویسی سے رہا۔ شروع شروع میں خیال یہ تھا کہ شاید خدا نے ہمارا رزق قلم ہی کے بہائے آمارا ہے۔ اور زندگی بھر ہم کو کاغذ ہی پر روٹی ملے گی۔۔۔ مگر ۱۹۳۸ء کے وسط میں زندگی کا دوسرا دور شروع ہو گیا۔ اور اب گائے بھانے سے روٹی ملنے لگی۔ ریڈیو کی ملازمت کی پچھلی آرٹیکل پر زمین گئے۔ سونگ پلیٹی میں آئے

مگر ابھی چونکہ یہ دور نامتناہی ہے اور معلوم نہیں ابھی قسمت میں اور کیا کیا لکھا ہے۔ لہذا ہم اپنی راء کہ ساری اخبار نویسی کے دور کے اختتام تک فی الحال پیش کر رہے ہیں۔ مابعد دولت کے بعد دوسرا حصہ اس جانب ابھی پیش ہونے والی چیز نہیں بلکہ اس کو ہم برابر مرتب کرتے رہیں گے۔ اور قاتلاً وہ اس وقت پیش ہو سکے گی۔ جب پیش کرنے والا دنیا کی جوابدہی کے بجائے کسی اور جوابدہی میں مبتلا ہو گا۔ اس کے بعد میں نے کوشش کی ہے کہ تمام موٹے موٹے واقعات سامنے آجائیں۔ چھپانے اور جانے کی کوشش محض ان واقعات کے سلسلے میں کی گئی ہے جن سے ہمارے علاوہ کسی اور کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ ہم نے تو خیر و کھلی میں سر ڈال ہی دیا ہے۔ مگر گہروں کے ساتھ گہن کیوں پس۔ لہذا اس قسم کے واقعات اگر بیان بھی کئے ہیں تو فریق ثانی کا نام لئے بغیر ظاہر کئے ہیں۔ اس لئے کہ مدد شنی میں ہم خود آنا چاہتے ہیں کسی اور کی لغزشوں پر روشنی ڈالنا مقصود نہیں۔ پھر بھی اگر کسی کو اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہم سے کوئی شکایت پیدا ہو تو ہم نہایت مشرافت کے ساتھ معذرت خواہ ہونے کی پوری کوشش کریں گے۔

ادارہ فریڈرک اور دولاہور کے مالک محمد طفیل صاحب اس وقت بھی لکھنؤ میں موجود ہیں۔ آپ کا اس خاکسار کے متعلق جو کچھ بھی خیال ہے اس کو تو آپ ہی جانتے ہوں گے۔ مگر اب اس نیاز مند سے کام لیتے ہیں ٹائپ رائٹر کا اور خیال آپ کا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور سے آکر محض آپ کا یہ کہہ کر بیٹھ جانا ہی کافی ہوتا ہے کہ اے ٹائپ رائٹر لکھ دے ایک کتاب جلدی سے چنانچہ آپ بیٹھے رہتے ہیں اور ٹائپ رائٹر لکھتا رہتا ہے۔ یہ کتاب بھی آپ نے اس ٹائپ رائٹر سے لکھوائی



ہے اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کے متعلق بہانے ذہن میں کچھ نوٹ پہلے سے تیار تھے مگر ان کو تحریری شکل میں ترتیب کے ساتھ لانا اور رہا بھی اس صورت میں پاسبانِ عقل کسی وقت بھی دل کو تنہا نہ چھوڑے ایک عجیب قسم کی سزا ہے۔ گرمیوں میں کوئی تحریری کام کرنا یونہی بد مذاقی کی ویں ہے۔ مگر ہم نے بھی اسی زمانہ میں یہ حالات اسی وجہ سے قلمبند کر دیئے کہ گرمیوں میں کسی خوش مذاقی کا بھی امکان مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے اب معلوم نہیں طفیل صاحب اس کتاب کے ساتھ کیا سلوک کریں گے مگر استدعا

ہم ان سے یہی کہہ رہے ہیں کہ ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے اٹھے

شوکت تھانوی

لکھنؤ ۲۸ جون ۱۹۷۷ء

## پیدائش وغیرہ

کتنی سچی بات کہی ہے جس کسی نے بھی کہی ہے کہ ہر زمانہ میں اور دنیا کے ہر گوشہ میں ایک قطب اور ایک احمق ساتھ ساتھ پیدا ہوا کرتا ہے یہاں تک کہ ہر ملک میں ایک قطب اور احمق ہوتا ہے۔ یعنی اس پایہ کا قطب جس کی قلبیت کو تمام ملک تسلیم کر لے۔ اور احمق بھی اس پایہ کا جس کی حماقت کے سامنے تمام ملک کے احمق سر تسلیم خم کر دیں۔ اسی طرح ہر صوبہ کا ایک قطب ہوتا ہے اور ایک احمق۔ پھر ہر شہر کا ایک قطب اور ایک احمق یہاں تک کہ ہر محلہ کا ایک قطب اور ایک احمق۔ اور اکثر تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی گھر میں ایک بھائی قطب ہوتا ہے تو دوسرا احمق، دو بیٹے اپنی اپنی جگہ تسلیم ہوتے ہیں، اور دو دونوں کا حلقہ اثر جدا جدا ہوتا ہے۔

اب خدا اس کلیہ کی صداقت ملاحظہ ہو کہ کہاں کرشن مراری اور کہاں ایک ادبی مداری، زمانہ ایک نہ سہی مگر مقام ایک ہی ہے۔ کرشن کا استھان بڑا بڑا

ضلع مٹھرا جہنم بھڑی بنتا ہے کس کی ! ..... شوکت بخاؤی کی .... یہ ایک تاریخی لطیفہ نہیں بلکہ ایک حقیقتا جگتا واقعہ ہے، بندرا بن کے کوتوال صاحب منشی صدیق احمد صاحب مرحوم جو پہلے تو اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے مگر شادی کے بارہ سال بعد اولاد ہوئی بھی تو لڑکی۔ اب اولاد کی تنہا پوری ہو گئی، مگر پاسے بزرگ لڑکی کو نصف اولاد سمجھا کرتے تھے جس طرح لڑکا شوہر آج بھی اس کو نصف بہتر سمجھنے کا قائل ہوتا ہے، منشی صدیق احمد صاحب اس طرح نصف صاحب اولاد ہو کر اپنی نصف بہتر کے ہاتھ قائل ہو سکے اور اپنے ارمان کی تکمیل کے لئے پھر چار سال تک پیاسے کو انتظار کرنا پڑا یہاں تک کہ دو فروری ۱۹۰۷ء کو صبح ہونے سے قبل ہی ان کی یہ تنہا بھی پوری ہو گئی اور اولاد زینہ سے بھی ان کی نصف بہتر کی گود پر ہو گئی، سپاہیوں نے گولے دے دیے بھانڈوں نے ڈھول بجائے، بٹوں نے کرتب دکھائے، ایک ہفتہ تک جہل پہل رہی۔ لوگوں نے اس ولادت کو وہ اہمیت دی گویا دنیا میں یہ واقعہ اپنی قسم کا پہلا ہے، بچے پیدا ہی ہوتے رہتے ہیں مگر کوتوال شہر کا بچہ ہمیشہ پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہمیشہ پیدا ہوتا تو ہمیشہ ہی دھوم دھڑکے ہوتے ہیں، کوتوال صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کا موقع اگر خود ان ہی کے گھر میں پیدا ہو جائے تو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہئے جس کو دیکھنے بچے کو دیکھنے اور کوتوال صاحب کی مبارکباد دینے کے لئے چلا آ رہا ہے، کہیں سے چھٹی آرہی ہے کہیں سے ناچے رنگ کے ساتھ بدھاوا، کہیں سے کرتے ٹوپی اور کہیں سے محض مٹھائی، کوئی کہتا ہے کوتوال صاحب آپ بچے کا نام "بندرا بن داس" رکھ دیجئے، ایک فارسی پندت

جی نے بڑی قابلیت سے فرمایا کہ صاحبزادے کا شہد اسم شیاہ بن صدیق رکھ  
 دیجئے، مگر حقیقت کے دن نام رکھا گیا محمد عمر اور تاریخی نام نکلا شیخ احمد، یہ ان ہی  
 حضرت کا نام اور تاریخی نام ہے جن کو اب شوکت تھانوی کہا جاتا ہے، تھانوی  
 اس لئے نہیں کہا جاتا کہ پیدائش بتدراین تھانہ میں ہوئی تھی بلکہ اس لئے کہ  
 تھان بھون ضلع منظر نگر اس خاندان کا وطن ہے اور ہر چند کہ اب اس  
 خاندان کے افراد خانہ بدوش نظر آتے ہیں، مگر تھانہ بھون کے محلہ محلّت  
 میں آج بھی جتنے ٹوٹے پھوٹے مکانات ہیں وہ اسی خاندان کی اوالہ عزمی کے مزار  
 سمجھے جاتے ہیں۔

## بہوشی کی باتیں

پیدائش سے لے کر اس وقت تک کی زندگی جب تک کہ بچہ ہوش نہ  
 سنبھالے۔ دراصل اس کی ذاتی زندگی نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت ایک  
 کھلونے کی ہوتی ہے جس سے اس کے والدین جس طرح ان کا جی چاہتا ہے کھیلتے  
 ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ بچہ کھیل رہا ہے۔ حالانکہ بچے کا ہر کھیل خود ان کا کھیل ہوتا ہے  
 اور بچے کی آڑ میں بچے سے زیادہ یہ خود کھیلتے ہیں میں اپنے اس زمانہ کو اپنا ذاتی  
 زمانہ نہیں بلکہ روایتی زمانہ کہہ سکتا ہوں اس لئے کہ اس دور کی کوئی بات بھی  
 مجھے یاد نہیں، البتہ اس دور کی کچھ روایتیں سنیں ہیں جن میں سے چند قابل ذکر ہیں  
 اور ان کو اجمالی طور پر بیان کر کے میں اس دور سے گزر جانا چاہتا ہوں، سنا ہے کہ  
 میرا یہ زمانہ زیادہ تر بیماریوں میں گزرا۔ والد صاحب کی رشوت کی تمام آمدنی ڈاکٹروں



کی نفیس اور دواؤں کی قیمت میں صرف ہو جاتی تھی۔ مالِ حرام سببِ حرام کیونکر صرف نہ ہوتا، ضعیف معذہ کی شکایت اس قدر شدید تھی کہ ڈاکٹروں نے غذا پر نہایت سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں سنا ہے کہ اس زمانہ میں ہم کو کھانے کے وقت کا نہیں بلکہ والد صاحب کے کھانے کے وقت کا انتظار رہتا تھا تا کہ وہ کھانا کھانے کے بعد انگلیاں ہم کو چٹا دیں۔ یہ واقعہ ہے اس وقت کا جب عمر غالباً سات سال تھی اور اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری شاعری کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے، روایت ہے کہ ہم نے پہلا شعر اسی فاقہ مستی سے متاثر ہو کر اسی عمر میں کہا تھا۔ حالانکہ اس وقت نہ گھر میں شعر و شاعری کا چرچا تھا، نہ کسی قسم کا کوئی ادبی ماحول مگر شاعری اور فاقہ مستی میں جو چوٹی دامن کا ساتھ ہے وہ یہاں بھی کارفرما ہوا اور سات سال کے اس فاقہ مست نے غیر شعوری طور پر ایک مطلع عرض کیا۔ ملاحظہ ہو۔

نہ دانا نہ پانی میں کس سے کہوں ۛ اے میرے اللہ میں بکیا کروں  
روایت ہے کہ ایک سنٹھے میں کپڑا لپیٹ کر ہم گویا علم بناتے تھے اور یہ علم اسی مرثیہ کے ساتھ اٹھاتے تھے۔ اور پھر زور شور سے ماتم ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں والد صاحب کا قیام مکنو میں تھا۔ اور مکنو میں بچوں کا علم اٹھانا یا مرثیہ پڑھنا کوئی عجیب بات نہیں، دن رات وہ یہی دیکھتے رہتے ہیں۔

## ہوش کی باتیں

میری زندگی کا وہ دور جس پر میں خود روشنی ڈال سکتا ہوں، بھوپال سے شروع

ہوتا ہے جہاں والد صاحب کی خدمات یوپی پولیس سے حاصل کی گئی تھیں۔ اور آپ  
 ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدہ پر فائز تھے۔ میں نے اپنی ہوش کی آنکھیں  
 بھوپال کے ایک عالیشان مکان میں کھولیں۔ باہر ایک پولیس گارڈ پہرہ پر رہتا  
 تھا۔ اندر ہمارا پورا خاندان، کئی کئی ملازم ہمارے ساتھ کھیلنے کے لئے ماموں  
 کے بچے ناز برواری کے لئے ماں باپ سے لے کر دور اور قریب کے رشتہ دار  
 بلکہ آئے گئے سب بڑے لاڈ پیار میں زندگی کے دن گزر رہے تھے کہ  
 معلوم نہیں کس نے والد صاحب کو یہ مشورہ دے دیا کہ لڑکے کی تعلیم شروع ہونا  
 چاہئے اور آخر کار ایک ماسٹر صاحب بلائے گئے۔ معلوم ہوتا تھا بتدریج  
 تماشہ شروع کریں گے۔ ویسی ہی سرپرستری ہوئی ابھی ہوئی وارڈن بھی ہو ہو  
 گڈی ناچہرہ معلوم نہیں وہ خود بھی کچھ پڑھے لکھے تھے یا نہیں بہر صورت ہمارے لئے ان  
 سے بہتر معلم بھوپال میں گویا کوئی اور نہ مل سکا۔ ان حضرات نے مولوی محمد اسماعیل  
 میرٹھی کی ریڈروں کو رٹا نا شروع کیا مگر کچھ ہی دن پڑھا سکے تھے کہ ایک دن والد  
 صاحب نے ان کو پڑھاتے ہوئے کسی لفظ کے غلط تلفظ پر جو غور کیا تو اسی دن ماسٹر  
 صاحب کا حساب کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور ماسٹر آئے جو چوتھے دن اس لئے  
 نکال دیئے گئے کہ وہ ذرا سخت قسم کے آدمی تھے۔ اور مارپیٹ میں ہاتھ کھلا ہوا تھا  
 ہماری والدہ کی پرنسپل اسسٹنٹ یو جعفری خانم نے جو ہمارے حق میں گویا  
 مشیر تعلیمات بھی تھیں۔ والدہ سے کہا کہ "اے ہے مولے ماسٹر کو صدقے  
 کروں اپنے بچے پر سے نگوڑے کی صورت دیکھو ننھا سا کلیجہ دہل جاتا ہے  
 بیوی اس مولے کا تو آج ہی حساب کر دیجئے" چنانچہ ان پیارے کا فوراً حساب

کر دیا گیا۔ اب ایک اور ماسٹر صاحب آئے جن کا اسم مبارک میرا محمد علی تھا  
 بوٹا سا قد، ناک کی پھٹکی پر روپہلی عینک، منہ میں کچھہرہ دانت اور باقی پان جیب  
 میں گھڑی اور گھڑی کی زنجیریں لٹکا ہوا قطب نما اس وقت بھی ان کی تصویر آنکھوں  
 کے سامنے گھوم رہی ہے۔ اسی زمانہ میں ایک جوتے کی پالش بہت چالو تھی جس کی  
 پرہلی کا چہرہ ہوتا تھا۔ ہمارے یہ ماسٹر صاحب بالکل اسی پل کی شکل کے تھے  
 اور مزاج تو ایسا لا جواب پایا تھا کہ خدا ہر طالب علم کو ایسا ہی ماسٹر عطا  
 فرمائے۔ آنکھ موچی دھپ کھیل رہے ہیں چنانچہ ماسٹر صاحب دوسرے ہی دن  
 ہٹائے گئے۔ اور پھر زندگی بھر ہم کو ان کا نعم البدل نہ مل سکا۔

## الگزنڈرا ہائی اسکول

بھوپال میں اس وقت دو ہائی اسکول تھے۔ ایک الگزنڈرا ہائی اسکول  
 اور دوسرا جہانگیرہ ہائی اسکول، الگزنڈرا ہائی اسکول صاحبزادگان بلنداقبال کا  
 اسکول سمجھا جاتا تھا۔ اور جہانگیرہ ہائی اسکول بندہ زادوں کی تعلیم گاہ تھی الگزنڈرا  
 ہائی اسکول کے ٹھاٹھ ہی کچھ اور تھے۔ طالب علموں کے لئے دردی ضروری تھی سیاہ  
 شیروانی اور آسانی صاف، عمارت بڑی پر تکلف، سامان سب قیمتی، مختصر یہ  
 کہ ان دونوں ہائی اسکولوں میں اس وقت یہ کھلا ہوا امتیاز تھا۔ گویا ایک  
 دارالامراء ہے اور دوسرا دارالعوام، والد صاحب نے لوگوں کے کہنے سننے  
 میں آکر آخر ہمارا داخلہ الگزنڈرا ہائی اسکول کئے۔ INFANTS CLASS جماعت  
 اطفال میں کرا دیا۔ اب ہم سیاہ شیروانی اور نیلے صافے میں ایک سپاہی کے

ساتھ انگنڈا ہائی اسکول جاتے گئے۔ دوپہر کو ایک دوسرا سپاہی ٹفن کیریر میں کھانا  
لے کر آتا تھا اور ہم پڑھتے کیا تھے۔ اسکول میں بھی گڑیا کھیلتے تھے۔ اس زمانہ کے  
اپنے کسی ماسٹر کا نام ہم کو یاد نہیں رہا۔ البتہ اپنے دو ہم جماعتوں کا نام  
ابھی یاد ہے۔ اور علیہ بھی ذہن میں محفوظ ہے ایک کا نام منظر تھا اور دوسرے  
کامنو میاں ہماری دوستی ان دونوں سے اس قدر بڑھ گئی کہ کچھ دنوں کے بعد  
جب ہماری استاد او کا اندازہ کرنے کے بعد درجہ چڑھانے کی رائے ہوئی تو  
ہم نے رونا شروع کر دیا۔ ماسٹر حیران تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے ترقی پر رونے  
کا کون سا موقع ہے مگر ہم نے صاف انکار کر دیا کہ منظر اور منو میاں کو تھوڑا  
ہم ترقی پر نہ جائیں گے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ ترقی کا تصور ہی ہمارے ذہن میں  
نہ تھا۔ اور نہ تعلیم کی سنجیدگی سوائے اس کے کہ کبھی ہم سمجھ سکے کہ ہم کو کھیل سے  
روکنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ پڑھنے بٹھا دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی  
واقعہ ہے کہ عقلمند بھی کافی تھے۔ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ سید ریات علی صاحب  
کا (جو اب سر سید ریات علی ہیں) سامان ہمارے یہاں اماٹار کھوایا گیا  
اس لئے کہ سر ریات علی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن بریلی تشریف  
لے جا رہے تھے۔ والد صاحب نے ہم سب کو جمع کر کے نہایت سختی کے ساتھ  
ہدایت فرمائی کہ اس سامان کی کوئی چیز ہم لوگ نہ چھوئیں۔ حالانکہ  
اس سامان میں بہت سی چیزیں ایسی تھیں جن کو نہ چھونا کفرانِ نعمت کا درجہ  
رکھتا تھا۔ مگر اب تو مانوت ہو ہی گئی تھی۔ کرتے تو کیا کرتے۔ پھر بھی اس دن  
جب یہ اطمینان ہو گیا کہ والد صاحب اب دوپہر کا کھانا کھا کر سو گئے ہیں



اگر ہم ان چیزوں کو چپکے سے چھو بھی لیں تو ان کو اطلاع نہیں ہو سکتی۔ ہم نے چپکے چپکے ایک ایک چیز کو چھونا شروع کیا۔ گھومنے والی کرسی کو چپکے سے نچایا۔ جھونے والی کرسی پر بیٹھ کر جھولے۔ الماری کے اندر بند ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ اس سے چور اور شاہ کے کھیل میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ مختلف چیزوں کا معائنہ کرتے ہوئے ایک بڑی خوبصورت سی گھڑی کو جو ہم نے چھوڑا اور اس کے کل پرزوں کا جو جائزہ لیا تو اس کی بخت نے ایک دم شور مچا دیا۔ اور لگی اس کی گھنٹی بجنے اب لاکھ لاکھ اس کے آگے ..... ہاتھ جوڑتے ہیں تو بہرتے ہیں۔ کان پکڑتے ہیں۔ مگر وہ نہ اب چپ ہوتی ہے نہ جب کرتے کے دامن میں اسے چھپایا الماری کے اندر اسے بند کرنے کی کوشش کی اور آخر عین اس وقت جب کہ ہم اس کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے اور وعدہ کر رہے تھے کہ اب تم سے نہ بولیں گے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ والد صاحب کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ انھوں نے بہت پیار سے ہم کو بلا کر کہا :-

”دیکھ لیا تم نے چوری کبھی نہیں چھپتی اور جو بڑوں کا کہنا نہیں مانتے

ان کا بھانڈا اسی طرح پھوٹتا ہے۔ اچھا اب کبھی ان پر الی چیزوں کو نہ چھو نا۔“

گھڑی نے اس بڑی طرح جھلی کھا لی تھی کہ ہم واقعی ہم کر رہ گئے تھے۔ اور

اس کے بعد ہم نے وہ سامان پھر کبھی نہیں چھوا۔ مطلب کہنے کا یہ کہ اگر ہم کو گھڑی کے آگے ہاتھ جوڑ کر بند کرانے کی کوشش کرنے والا عقلمند اسکول میں

ترقی ملنے پر اگر رو دیا تو تعجب کی بات نہیں ہے مگر یہ ترقی زبردستی ہمارے سر منڈی گئی اور ہم کو درجہ اول میں جانا پڑا۔ الگزنڈرا ہائی اسکول میں ہمارا بہت کم

زمانہ گزرا اس لئے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد والد صاحب نے بھوپال کی ملازمت ترک کر دی اور ہم لوگ لکھنؤ آ گئے۔ اس اسکول کی پڑھائی اور اس کے ماحول وغیرہ کے متعلق ہم کوئی مستقل رائے قائم کرنے کے قابل ہی نہ تھے اور نہ کوئی رائے قائم کر سکے۔ البتہ اتنا تو ہم کو اب بھی احساس ہے کہ اسکول کی تعلیم بایرا یونیورسٹی ٹیوٹروں کی تمام جدوجہد سے زیادہ ہم پر اثر اس تربیت کا ہوا جو بھائی جان مولانا ارشد نقا نوی کی طرف سے ہم کو حاصل ہو رہی تھی۔ ہمارے ذہن میں نہ معلوم یہ کیوں جم گیا تھا کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی سراج یہ ہے کہ وہ بھائی جان کا ایسا ہو جائے، ارشد صاحب ہمارے حقیقی چچا زاد بھائی ہیں۔ اور ان کے والد ہمارے بڑے آبا اس زمانہ میں بھوپال ہی میں وکالت کرتے تھے۔ بھائی جان کو ہم نے اپنے لئے ایک سیار بنالیا تھا۔ وہ سوٹ پہنتے تھے۔ ہمارا جی چاہتا کہ ہم بھی سوٹ پہنیں۔ وہ بڑے ٹھسے سے چائے پیتے تھے۔ ہزاروں سحروں کے ساتھ کہ پانی زیادہ جوش کھا گیا ہے۔ پتی کمرہ گئی ہے۔ دودھ میں نقص ہے کہ بھینس نے غائبنا حفظان صحت کے اصولوں کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ چارہ کھا لیا ہے جس میں دھان کی گئی تھی۔ ہم ان تمام باتوں کو سنتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ سمجھ بوجھ ہم میں گئی پیدا ہو جائے کہ دودھ کو چیک کر بھینس کے مشاغل کا اندازہ کر لیا کریں۔ بھائی جان کے ادبی مشاغل کا رعب ہی قائم تھا۔ ہم ان کے ساتھ ان کے دوستوں کے یہاں جایا کرتے تھے اور وہ جو باتیں کرتے تھے ان کو ہم ذہن میں محفوظ رکھتے جاتے تھے۔

## اخبار پھول

اسی زمانہ میں بھائی جان نے ہمارے نام لاہور کا اخبار پھول منگانا شروع کر دیا اور یہ اخبار ہماری تمام اسکولی کتابوں سے زیادہ ہمارے لئے مفید ثابت ہوا۔ اخبار پر ہمارا پتہ اور چھپا ہوا نام یہ وہ باتیں تھیں جن کو دیکھ کر ہم اپنی اہمیت کا انداز ہونے لگا تھا۔ کہ ہم بھی وہ میں جس کا نام چھپا ہوا اخبار پر پست کر اس طرح آتا ہے اخبار کی کہانیاں پڑھ کر گھر بھر کو سنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اخبار کا ایک ایک پرچہ بڑی احتیاط سے رکھا کرتے تھے۔ اب بھائی جان نے ایک نئی ترکیب کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں خود لکھتے تھے اور ہمارے نام سے پھول میں چھپنے کو بھیج دیا کرتے تھے۔ اب تو ہمارا پوچھنا ہی کیا۔ مضمون نگار ہو گئے تھے۔ اپنے نام سے چھپی ہوئی کہانیاں سب کو دکھاتے پھرتے تھے۔ دراصل ادبی ذوق اسی وقت بھائی جان نے معلوم نہیں جان بوجھ کر یا غیر ارادی طور پر ان صورتوں سے ہم میں پیدا کیا تھا جس کو بعد میں وہ دوسری صورتوں سے ابھارتے رہے مگر ان کو یہ خیال کبھی بھی نہ تھا کہ یہی ذوق اس لڑکے کا مستقبل بن جائے گا۔ وہ بیچارے سنجی طور پر ادیب اور شاعر سب ہی کچھ تھے اور باضابطہ طریقہ پر دکیل اور کوٹ انسپکٹر وغیرہ تھے۔ اخبار پھول کے لئے ہم کو یاد نہیں پڑتا کہ خود ہم نے بھی کچھ لکھا ہو نہ سکر پھول سے اپنی دیکھی ہم کبھی نہ بھول سکیں گے۔ کیا سماں کہ پھول کا کوئی پرچہ ذرا سا بھی میلایا ہو جائے یا کوئی کہیں اٹھا کر لے جائے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ ان حضرات کی اولاد ہے تو یہی اخبار اور جائیداد ہے تو یہی اخبار تعجب کی بات یہ ہے کہ جس طرح

بچے اپنی کتابوں پر اپنا نام لکھتے پھرتے ہیں ہم نے کبھی اپنے اخبار پھول پر اپنا نام بھی نہیں لکھا کہ اخبار خسر اب ہو جائے گا مختصر یہ کہ ہم اپنی سب سے بڑی درسی کتاب اسی اخبار پھول کو سمجھتے تھے۔

## حجالت

ہمارے نام پھول آتا تھا اور باجی ظہور خاں، جو اب خاتون ارشد ہیں، کے نام تہذیب نسواں، ہم کو تہذیب نسواں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، مگر ان کی نیت کبھی کبھی پھول کے لئے ڈواں ڈول ہوا کرتی تھی۔ اور یہ بات ہم کو پسند نہ تھی وہ ہمارے عدم موجودگی میں پھول کے ترتیب سے رکھے ہوئے پرچے بے ترتیب کر دیا کرتی تھیں اور ہم آکر اس بات پر ان سے لڑا کرتے تھے۔ غائبانہ اسی قسم کی کسی بات پر ایک دن ہم خفا تھے۔ اور وہ ہم کو ستا رہی تھیں۔ کہ ہمارے سر پر ہاتھ پھیرے ہوئے انھوں نے فرمایا کس قدر سخت بال ہیں معلوم ہوتا ہے جیسے سؤر کے بال۔ ہم یہ سن کر پہلے تو چپ ہو گئے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد چیخ لاکر ان کے لمبے لمبے بالوں کی ایک موٹی سی لٹکات ان کو دیتے ہوئے کہنا۔ "لو یہ ریشم کی کچھی" بڑی آنت مچائی۔ بڑی شکایت کی مگر ہم نے کہہ دیا کہ سؤر کے بالوں کا جواب یہی تھا کہ ریشم کی کچھی پیش کر دی جائے۔

## لکھنؤ

۱۹۱۷ء میں والد صاحب نے بھوپال کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر



بجائے تھانہ بھون جانے کے لکھنؤ کا رخ کیا۔ لکھنؤ سے ان کو سوائے سسرالی  
 و بھپسی کے اور کوئی دیکھسی نہ تھی ممکن ہے وطن سے اس لئے بھی دور رہنا پسند کیا  
 ہو کہ خار وطن اسی وقت تک سنبل و ریحان سے خوشتر محسوس ہوتا ہے جب تک  
 کہ انسان غربت میں اس کا تصور کرتا ہے لیکن جب غربت سے وطن پہنچ کر اس  
 خار وطن کو آزمانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تو پتہ چلتا ہے کہ خار تو خار یہاں  
 تو سنبل و ریحان سب میں غلش موجود ہے۔ میرے دوست دھل بلگرامی کے نام  
 سے ایک شعر مشہور ہے کہ۔

ان کی گل کار راستہ طرہ طلسم راز ہے

دور ہے پاس پاس سا پاس سے دُور دُور سا

وطن جس قدر غربت میں پیارا معلوم ہوتا ہے، اسی قدر قربت میں اس کی  
 محبت اور کشش ختم ہو جاتی ہے وطن اور اعزہ سے محبت کو برقرار رکھنے کے لئے  
 بہت ممکن ہے کہ والد صاحب نے لکھنؤ کو اپنا مستقر بنایا ہو، حالانکہ مشہور یہی تھا کہ  
 سسرال کی محبت پر گھر کی محبت تران کر دیا تھانہ بھون کی مٹی لکھنؤ کی خاک کا پیوند بنی۔  
 بہر حال کچھ بھی ہو، والد صاحب تے ذاتی مکان بھی یہیں بنوایا اور بھوپال سے واپسی پر اسی  
 عروس البلاد کی رنگینوں میں اچھ کر رہ گئے لکھنؤ میں ہمارے ماموں حکیم محمد یوسف صاحب  
 رہتے تھے۔ حالانکہ ان کے بال بچے سب ہم لوگوں کے ساتھ بھوپال میں تھے، اور وہ  
 نہ جانے کیوں اس جمع غائب کے باوجود لکھنؤ میں داخل ہوا تھا۔ لکھنؤ بھی ہم دھل  
 اس وقت آئے جب ہوش تو آچکا تھا مگر آدمیت سرے سے غائب تھی اور اگر سچ  
 پوچھئے تو باقاعدہ تعلیم اب تک شروع ہی نہ ہوئی تھی۔ والد صاحب اس

سلسلہ میں بلا کے بے پروا، والدہ صاحبہ بے چاری گھر کی بیٹھنے والی۔ لاکھ چاہا کہ  
 لڑکے کو کسی اچھے استاد کے سپرد کر کے کسی معقول اسکول میں بھیج دیں۔ مگر بس اتنا  
 ہی چلا کہ حضرت مولانا عین القضاۃ رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ فرقانیہ میں بھیج دیا  
 جہاں قرآن مجید کی تعلیم شروع ہو گئی۔ مگر پڑھائی سے زیادہ بڑے لڑکوں کی بری  
 صحبت کے اثرات ہم نے قبول کرنا شروع کر دیے۔ نہایت سخی گالیاں بقی  
 سے زیادہ یاد کر لیں۔ بغل بجانے کے کرتب سیکھے۔ سڑک پر کھڑے ہو کر مدار یوں  
 کے تماشے دیکھنے لگے۔ مدرسہ جانے کے لئے گھر سے چلے اور گلی ڈنڈا اٹھیلنے کیلئے  
 اپنے کسی دوست کے ساتھ کسی میدان میں پہنچ گئے۔ بازاروں سے چاٹ  
 کھانے اور پتے چاٹنے لگے۔ مختصر یہ کہ اس مدرسہ میں جو تربیت حاصل کی۔ اس  
 کے بعد ہم اسی قابل رہ گئے تھے کہ یکہ ہانکتے یا کباب پرائے کی دکان رکھ کر بیٹھ  
 رہتے۔ مگر عین وقت پر والدہ محترمہ کی توجہ پھر اپنے لاڈلے کی طرف ہوئی  
 اور آخر بیماری نے اپنے میٹھے والوں سے پڑوسیوں سے اور جو کوئی بھی ان کو  
 نظر آیا سب ہی سے کہہ سن کر ایک ماسٹر گھر پر رکھا۔

## ماسٹر چھوٹے لال

ماسٹر چھوٹے لال صاحب لکھنؤ میں ہمارے پہلے پرائیوٹ ٹیوٹر تھے بہت  
 اہتمام سے سر کے بالوں میں تیل لگا کر مانگ اس طرح نکالتے تھے گویا پیشانی کے  
 اوپر دو چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ اور ان دونوں کے بیچ میں تکی دیوار کی کشتی بنا ٹوپی  
 پہنتے تھے۔ نہ جانے ان کا مشغلہ صرف ٹیوشن تھا یا سب سے جو ٹیوشن کرنے نکلتے تھے تو شام

کو گھر پہنچتے تھے۔ نہ جانے کتنے لڑکے بڑھاتے تھے بہت محنت سے پڑھاتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ سختی نہ برتیں اور سبق یاد کرادیں۔ مگر ان کو اپنی کوشش میں کامیابی بہت ہی کم حاصل ہوتی تھی۔ ان کی محنت مسلم گمشاد گرد بنی کوئی معمولی قسم کا ہونہا نہیں تھا۔ بہر صورت ان بچوں نے انگریزی کی ایک آدھ کتاب کسی نہ کسی طریقہ ختم کر لی اور حساب وغیرہ میں بھی اپنے نزدیک ہم کو چسلا کر دیا۔ باقی مذاہن بھی ضمنی طور پر سہارے سالانہ سے وہ بچے گزارتے رہے لیکن یہ امسید ان کو بھی غالباً نہ ہو سکی کہ یہ سب سڈھے چڑھ سکے گی۔ بہر صورت وہ اس بے فکر کے ساتھ پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے کہ صاحبزادے پڑھ گئے تو خدا کی شان اور نہ پڑھ سکے تو مشیت ایزدی میں کیا چارہ۔ ان کو تنخواہ برابر مل جاتی تھی۔ عید، بقرعید، اور شبیرات کی رنگین عیدیاں ان کے نو تصنیف اشعار کے ساتھ ہم کو ہمیشہ ملا کرتی تھیں اور ان کو سہارے یہاں سے اس سلسلہ میں انعام ملتا تھا۔ ہمارے یہ ماسٹر صاحب شاعر بھی تھے۔ عاقصم تخلیق فرماتے تھے اور اس تخلیق کو عید، بقرعید، شبیرات کے لئے محفوظ رکھتے تھے۔ عید یوں ملے اشعار میں عاقصم جڑ دیا جاتا تھا جس کے متعلق بہت دنوں کے بعد پتہ چلا کہ یہ آپ کا تخلیق ہے۔ اور آپ صرف عیدیاں ہی نہیں کہتے کبھی کبھی مشاعروں میں غزلیں پڑھتے ہیں۔ ان کی ایک عیدی کا قطعہ یاد ہے۔

شبیرات آمد بغفل کردگار      ہے ہر اک شاد الی شالی نو بہار

پہلے بھڑکی جو خمد و انار سے      ہے زمین کا فرش شلی لالہ ترار

اس قطعہ میں لالہ بچائے خود تخلیق معلوم ہوتا ہے۔ اس لالہ شاہی قطعے کے

بعد اگر ان کی کسی غزل کا کوئی شعر یاد نہ رہا ہو تو غالباً اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں  
 ماسٹر صاحب کی یہ عیدیاں اس زمانہ میں بڑی دلچسپی سے واند صاحب اور ارشد  
 صاحب پڑھنا کرتے تھے۔ اور ہماری سمجھ میں بالکل نہ آتا تھا کہ آخر اس  
 میں اس قدر سنسنے کی کیا بات ہے۔

## تھانہ بھون کا پہلا سفر

اب تک ہم نے اپنا وطن کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور دیکھتے بھی کیسے جب والد  
 صاحب بخود وطن سے کتراتے رہتے تھے۔ لیکن ایک دن ہم کو یکایک معلوم ہوا کہ  
 والد صاحب تھانہ بھون جا رہے ہیں۔ اور ہم کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ کچھ نہ پوچھنے  
 خوشی کا عالم مگر یہ خوشی تھانہ بھون جانے کی نہیں بلکہ محض سفر کی تھی۔ اور والد  
 صاحب کے ساتھ سفر کرنے کی خوشی اس لئے اور بھی زیادہ ہوتی تھی کہ وہ سکند کلاس  
 میں سفر کرتے تھے۔ بہر صورت ہم تھانہ بھون پہنچنے اپنے عزیزوں کو پہلی مرتبہ  
 دیکھا۔ اپنے کعبیت دیکھے، اپنے گھر دیکھے۔ اسٹیشن پر پہنچ کر تو بہت گھبرائے تھے۔ کہ  
 یا اللہ یہ تو جنگل ہی جنگل ہے مگر جب آبادی میں پہنچے تو تسکین ہو گئی چچا میاں کے  
 اسٹیشن پر ڈرا دیا تھا کہ تمہاری چچی بی بی ہیں کہیں لکھا اس چھیلی ہوئی ملیں گی اور  
 ہم ایسے عقلمند کہ کچھ پہچانیں بھی آگیا تھا۔ مگر گھر جا کر دیکھا تو چچی بی بی لکھا اس نہیں  
 آلو چھیل رہی تھیں۔ تھانہ بھون کے اس سفر کی کوئی ایسی بات ہم کو یاد نہیں جس  
 کا اثر ہم پر گہرا پڑا ہو نہ وطن کے مفہوم سے ہم واقف تھے۔ نہ وطن کی کوئی خاص محبت  
 تھی۔ اب نہ تھانہ بھون کے پیرے جب بھی پسند تھے۔ اور اب بھی پسند ہیں۔



## آمد نامہ

غالباً والدہ صاحبہ کے طعنوں سے تنگ آ کر یونہی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ایک دن والد صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ خود ہم کو فارسی پڑھایا کریں گے۔ ہمارے لئے آمد نامہ خرید لیا گیا اور گھر کے باہر ایک میدان میں والد صاحب نے ایک چارپائی پر یہ مکتب کھول دیا۔ ان کا قول تھا کہ کسی کو آمد نامہ پر عبور حاصل ہے تو وہ نہایت آسان سے شیخ سعدی بن سکتا ہے اور اگر کسی کو پہاڑیے یاد ہیں تو اس کا ڈاکٹر ضیاء الدین ہو جسنا نہایت آسان ہے۔ چنانچہ وہ ہم کو شیخ سعدی اور ڈاکٹر ضیاء الدین بنانے کی فکر میں ہمیشہ رہے۔ تعلیم کے سلسلہ میں اول تو کبھی آپ نے کوئی دیکھی نہ لی۔ اور اگر کبھی باپ ہو جانے کا خیال آجاتا تھا اس ذمہ داری کا احساس بھی پیدا ہو جاتا تھا تو فوراً بوجھ بیٹھتے تھے کہ بتاؤ، "نونواں" اور ہم دل ہی دل میں نو کو نو سے ضرب دینا شروع کر دیتے تھے۔ اور جواب دینے بھی نہ پاتے تھے کہ ادھر سے سوال ہوتا تھا کہ "چھ سستے" اور ہم دعا کرتے تھے کہ باہر سے والد صاحب کے کسی دوست کی آواز آجائے۔ اس قسم کے موقعوں پر وہ ہمیشہ ہماری تعلیم کی طرف سے مایوس ہو جایا کرتے تھے۔ اور والدہ صاحبہ سے کہہ دیا کرتے تھے کہ نہ معلوم صاحبزادے کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ والدہ صاحبہ اس سلسلہ میں ان ہی کو ذمہ دار قرار دیتی تھیں۔ اور یہ بحث کبھی کبھی نہایت خوفناک طوفان کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ یعنی کھلنے کے رتن میں شکستن کا مصدر گردانتے تھے اور شریاں

فرش سے ضرب کھا کر اپنا پہاڑا خود ہو جایا کرتی تھیں۔ خیر یہ تمام باتیں غنیمت تھیں۔ اس لئے کہ ان کا کوئی تعلق ہم سے براہ راست نہ تھا۔ مگر والد صاحب کا یہ فیصلہ کہ وہ خود آمدنامہ پڑھائیں گے۔ ذرا خوفناک تھا۔ ماسٹروں سے تو اب تک یہ کہا جاتا کہ لڑکے کا گوشت پوست آپ کا اور ہڈیاں ہماری یعنی اس طرح مار دیتے کہ کھال اوڑھ کر جائے مگر ہڈی نہ ٹوٹے لیکن یہاں تھا یا آپ کا معاملہ گوشت پوست کے علاوہ ہڈیاں بھی اب پرانی نہ تھیں۔ ع

موت آئی تو ٹل نہیں سکتی

آمدنامہ لے کر میدان میں چار پائی پران کے سامنے بیٹھا ہی بڑا اور آمد۔ آمدند۔ آمدی۔ آمدید، آدم۔ آدم۔ کا پہلا سبق ہم کو دیا گیا۔ پہلا دن پہلا سبق اور والد صاحب سے پہلا سابقہ مگر معلوم ہوتا تھا کہ شامت اس پہلی ہی منزل پر استقبال کے لئے آئی ہوئی تھی۔ لاکھ لاکھ کوشش کرتے ہیں کہ سبق یاد ہو جائے ورنہ والد صاحب کے کوئی دوست آجائیں مگر نہ یہ ہوتا ہے نہ وہ جھوم جھوم کر یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے سنتے ہیں۔ مگر دماغ کسی طرح اس غیر زبان کو قبول نہیں کرتا۔ یا اللہ یہ کس گناہ کا عذاب ہے جس کا نام ہے آمدنامہ۔ والد صاحب نے ایک گھنٹہ کا وقت دیا تھا اس پہلے سبق کو سننے کے لئے اور یہاں کے آثار یہ تھے کہ ع

آہ کو چاہئے کہ اک عمر اثر ہونے تک

آخر موت کی گھڑی آیا ہو چکی۔ والد صاحب سبق سننے کے لئے بیٹھ گئے اور

باجیزادے کو رے کے کوئے گویا اب تک کچھ پڑھا ہی نہیں ہے آخر طوفان امڈا  
برقی در عذاب لزلہ، انہدام پیچھے، گرجے، جتنے کی چلم الٹ گئی۔ آمدنامے کے پڑنے

فنائین ایران کی آزادی کے پرچم اڑانے لگے۔ اور ہم ہندوستان کی غلامی کی زندہ تصویر بنے اپنی موت کے منظر سرنگوں بیٹھے ہی تھے کہ یکایک والد صاحب نے پکڑ کر جوہم کو جھنجھوڑا ہے تو تندیبا کا کرتہ معہ بنیائیں ان کے ہاتھ میں تھا۔ اور اس کا گریباں پہاڑے برہمنہ سیم پر معلوم یہ ہوتا تھا کہ فارسی کی سب سے بڑی فضیلت حاصل کی ہے۔ اور یہ کوئی خاص ایرانی چیز ہے۔ جوہم پہنے بیٹھے ہیں۔ پکڑوں کے بعد اب غائب کھال کی یاری تھی۔ کہ اس سنگامہ کی اطلاع پا کر ماموں صاحب گھر سے نکل آئے۔ والدہ نے گھر کی سے جھانکنا شروع کیا۔ راہ گیر چلتے چلتے گھر سے ہو گئے۔ اور کتے نے دم ہلانا چھوڑ دی ماموں صاحب نے اکرم کو دہاں سے اٹھایا اور مشکل تمام گھر کے اندر پہنچا دیا اور والدہ صاحبہ نے سچے دل سے تو یہ کہی کہ اب کبھی والد صاحب کو ہماری تعلیم کی طرف متوجہ نہ کریں گی۔ گویا یہ سبق والد صاحب نے ہم کو کم اور والدہ صاحبہ کو زیادہ دیا تھا

## کالہ

بھائی جان مولانا ارشد تھا نوی بھوپال سے جب کبھی لکھنؤ تشریف لاتے تھے ہم گویا ان کے تہیمہ کے طور پر ساتھ ہی ساتھ رہتے تھے۔ اس زمانہ کے ان تمام دوستوں سے ہم مل چکے تھے۔ منشی پیارے لال شاکر میرٹھی جعفریت محنتی صدیقی بخاری عباس حسین ایڈیٹر رسالہ تمدن۔ مولانا ظفر الملک علوی خواجہ عبدالرؤف عشریت اور مولانا صیغۃ اللہ شہید انصاری فرنگی محل وغیرہ۔ ان حضرات کے یہاں کی تمام دعوتوں میں بھائی جان کے ساتھ مدعو ہوتے تھے۔ اور بھائی جان

جب ان حضرات کو اپنے یہاں بلاتے تھے اس وقت بھی ہمارا دسترخوان پر ہونا ضروری تھا۔ اس قسم کی ایک ٹی پارٹی میں صبح بالائی اور نہ جانے کیا کیا خاک بلا ہم نے کھائی۔ اور ایک بجے ہم پر کال کا نہایت شدید حملہ ہوا یہاں تک کہ مغرب کے وقت ہماری حالت غیر ہو گئی۔ اور ڈاکٹر نے آکر دیکھا تو نبضیں بھی ڈوب چکی تھیں اس وقت ہمارے تو ہوش بچا نہ تھے مگر سنا ہے کہ حاجی رختاؤن ارشد نے اپنے معصوم بچے سلمان الارشد کو گود میں لے کر کہا کہ اے خدا تو میرے بھائی کو تندرست کر دے۔ خواہ میرا یہ بچہ مجھ سے چھین لے۔ انڈیا میں اس کے یہاں تاوان لینے کا دستور تو ہے ہی نہیں مگر غالباً ان کی یہ دعا سن لی گئی۔ اور اس آخری حالت پر پہنچنے کے بعد ہم صحت یاب ہونا شروع ہو گئے۔ اب پرہیز بہت سخت تھا۔ ناقوں پر فاقے آخر ایک دن ہم نے ڈاکٹر سے جب یہ سنا کہ آج کے تیسرے روز مونگ کی دال کا پانی لے گا۔ تو اپنے ایک عزیز بچے کو چپکے سے پیسے دیئے کہ دو آنے کے لاؤ کباب اور دو آنے کے لٹو ریوڑیا اور اس خطرناک حالت میں یہ بد پرہیزی چپکے سے کر گزری۔ مگر کوئی نقصان نہ پہنچا ایک دوسری لا جواب چوری یہ کی کہ حاجی بھوپال جانے کے لئے تیار ہوئیں۔ ان کے لئے ناشتہ میں منجھ اور چیزوں کے کچھوڑیں بھی تلی جا رہی تھیں۔ ہم نے آنکھ بچا کر تین کچھوڑیں اڑالیں اور ان کو اطمینان سے کھانے کے لئے پافانہ میں پہنچ گئے حاجی نے کچھ تاڑیا اور وہ کھجوریں پیسے پہنچیں۔ ہم یونہی بیٹھے شوق فرما رہے تھے کہ انھوں نے اناج پانا ہم کھنکھارے مگر جواب ملا کہ ہم تو آئیں گے۔ اور فوراً سامنے آکر موجود ہوئیں اُدھی کچھوڑ منہ میں تھی اُدھی ہاتھ میں دو سند اس میں پھینک دیں اب جو انھوں

نے پوچھا کہ آپ یا جامہ باندھے قد بچوں پر کیوں تشریف فرما ہیں تو کچھوہ  
کو مشکل تمام نکل کر جواب دیا کہ بھول گئے تھے۔ مگر چوری پکڑی جا چکی تھی اور  
اب ہم کھسیا نے ہو کر غصہ پر تل گئے تھے۔

## مولانا عبد الرحیم کلیم

مولانا کلیم والد صاحب کے دوست تھے۔ مگر خدا نے مولانا کو شاید اسی  
لئے پیدا کیا تھا کہ والد صاحب ان پر اپنی تمام ذہانت صرف کرتے رہیں مولانا کو  
دیکھتے ہی عجیب عالم ہو جاتا تھا والد صاحب کا۔ نہ جانے کس قیامت کی  
آمد ہوتی تھی۔ ہر مرتبہ نئی بھتی سیویتی تھی۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ مولانا تھے ہی  
بڑے بھتی زیب، نہایت سیاہ رنگ چھوٹا سا قد، دو ہر اجسم، چہرے پر بال  
تقریباً اندازہ اور شکل ایسی کہ واقعی کسی انسان کی ایسی صورت اب تک ہم  
نے نہیں دیکھی۔ جانوروں میں البتہ بہت سے جانوروں کو ان سے تشبیہ دیا جاسکتا  
ہے۔ والد صاحب ان کو زنجار کا پر نش کہتے تھے۔ کبھی کلکتہ کے، زو، کا مفرد  
بن مالن کبھی ڈارون کے نظریات کا ثبوت اور ان سے ہمیشہ حسد سے گزرا ہوا  
کذاق ہوا کرتا تھا۔ والد صاحب اور ان کے لطیفے آج تک لوگ دہراتے ہیں مولانا  
کی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے ایک ادب و افتخار مشتمل نمودار خردائے کے  
طور پر بیان کرنا ضروری ہے اور پھر میں یہ ذکر کروں گا کہ میرے حالات میں  
مولانا کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔

لکھنؤ میں ایک ٹھیکر ٹیکل کمپنی کے ساتھ کلکتہ والی گوہر جان آئی ہوئی

تھی اور حال یہ تھا کہ ہشتی اپنی مشکیں بیچ کر اور لوگ قرض لے لے کر برابر تاشہ دیکھنے جاتے تھے ہر طرف گوہر جان کے نغمے گونجے ہوئے تھے۔ اور اسی ٹھیسٹر کے چرچے تھے۔ والد صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اشتیاق بھائی سے جو آج کل اشتیاق احمد عباسی پر سٹر ہیں۔ یہ کہا کہ تم کو ڈرائنگ کا بہت شوق ہے۔ تم سات آٹھ تصویریں بن مانس کی ذرا پوسٹر کے کاغذ پر بنا دو۔ چنانچہ یہ تصویریں فوراً تیار ہو گئیں۔ نہایت خوفناک بن مانس سات آٹھ کاغذوں پر تیار ہو گیا۔ اب ان پوسٹروں پر عبارت لکھی گئی کہ آج شب کو کلکتہ کی مس گوہر کے نغمے کے بعد لکھنؤ کے مولوی عبدالرحیم صاحب کلیم اپنا شہرہ آفاق بن مانس کا پارٹ ادا کر کے شائقین سے خراج تحسین حاصل کریں گے۔ ایک پوسٹر مولانا کے دروازے کے بالکل سامنے باقی ان مقامات پر جو مولانا کی گزر گاہ تھے۔ راتوں رات چسپاں کر دیئے گئے۔ اور حسب توقع صبح مولانا نے گھر سے نکلے ہی جو اس پوسٹر کو دیکھا تو آگ بگولا ہی تو ہو گئے۔ اپنی جھڑی سے اس پوسٹر کو لوگوں کی نظریں بچا بچا کر نوچا۔ اور نہایت برہمی کے ساتھ اس ارادہ کے ساتھ کہ کو تو اب پہونچ کر والد صاحب سے اس زیادتی کی شکایت اور تفتیش کا مطالبہ کریں گے۔ والد نے ہنس مے خیال تھا کہ بس یہی ایک پوسٹر ہو گا۔ مگر بازار میں پہونچے تو وہاں لوگوں کا ایک جھوم اس پوسٹر کو پڑھ کر دھچکی لے رہا تھا۔ مولانا نے گھر آکر راستہ کاٹا۔ بجائے سڑک کے ایک گلی میں گھس گئے مگر اب جو کو تو والی کے دروازے پر پہونچے ہیں تو وہاں بھی پوسٹر اور پڑھنے والوں کا ہجوم تھا۔ قہقہوں کا شور اور جھتیوں کی جو جھاڑاں سے نئی کھانگے اور کسی نہ کسی طرح عام نظروں سے اپنے آپ کو



بچاتے ہوئے گھر جا کر بیٹھ رہے۔ آخر کار پستہ چل گیا کہ یہ حرکت کس کی تھی جفا  
 ہو گئے۔ بات چیت اور عا سلام۔ مرنا جینا سب ترک عاشورہ کے دن حسین آباد  
 کی ضریح کا جلوس نکلنے کے بعد والد صاحب نے دیکھا کہ مولانا برہنہ سربرہمنہ پیا  
 تشریف لے جا رہے ہیں۔ آپ نے مولانا کو مخاطب کئے بغیر عم عسٹرم چودھری  
 شفیق الزماں صاحب تعلقہ ارگڑھی سے فرمایا۔ شفیق بھائی کلیم سے لاکھ لڑائی  
 سہی۔ مگر اس میں بعض خصوصیات تو ایسی ہیں کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا  
 مولانا یہ سنتے ہی تمام لڑائی جھگڑے کو بھول کر ان لوگوں کے پاس آگئے  
 اور والد صاحب سے فرمایا۔ کیسی لڑائی اور کہاں کا جھگڑا۔ مگر تجھے میری  
 قسم صدیق وہ تو ابھی کیا کہہ رہا تھا۔ والد صاحب نے فرمایا۔ میں آپ سے  
 تو کچھ کہہ نہیں رہا تھا اور نہ میں خوشامد کو پسند کرتا ہوں۔ البتہ جو واقعہ ہے  
 اس سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔ شفیق بھائی سے یہی کہہ رہا تھا کہ کلیم صاحب  
 کی بعض خصوصیات سے انکار نہیں ہو سکتا۔ مولانا نے اور قریب ہو کر کہا۔ وہی  
 تو میں پوچھ رہا ہوں۔ تجھے خدا کی قسم بتا تو سہی مجھے بھی۔ والد صاحب نے نہایت  
 سنجیدگی سے کہا۔ ارے مثلاً آپ کا چہرہ ماہی مراتب کے ساتھ جلوس کے  
 آگے گزر گیا۔ اور آپ یہاں ٹہل رہے ہیں۔ پھر وہی نکالیاں وہی برہمی اور وہی  
 دشمنی جس پر ہزاروں دوستیاں قربان ہو سکتی ہیں۔ ایک دعوت کے موقع پر والد  
 صاحب کو پہنچنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ پہنچے تو دیکھا کہ ان کے ایک دوست کے نہایت  
 گویے چٹے بچے کو مولانا کھلائے ہیں۔ بچہ ان کے کندھے پر بیٹھا تھا لوگوں نے والد  
 صاحب سے شکایت کی آخر اتنی دیر کیوں کر دی آپ نے نہایت تشویش

سے فرمایا۔ سال کاشتگون نکل رہا تھا۔ میں بھی ذرا وہاں ٹھہر گیا۔ مگر خدا ہی خیر کرے اب کی نوروز سوڑ پر سوار ہے یہ محفل میں تہقہہ پڑا اور مولانا نے بڑا اس ہو کر بچے کو کندھے سے اتار دیا والد صاحب نے وصیت نامہ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو مولانا کی سوانح حیات کا درجہ رکھتی ہے۔ احباب میں بے حد مقبول تھی اور اس کو سنتے کے لئے محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد اس وصیت نامہ کی اشاعت پر زور دیا گیا۔ مگر میں نے اس کتاب کی اشاعت کو کسی طرح مناسب نہ سمجھا۔ جس کو خود والد صاحب نے باوجود اس قدر مقبولیت کے طبع کرانا کبھی پسند نہ کیا مولانا کلیم کی پہونچ اسی مذاق کے سلسلہ میں والد صاحب کے ساتھ ساتھ جہا راجہ صاحب محمود آباد، جہا راجہ صاحب رامپور اور اسی طرح تمام ادبچی سوسائٹی میں تھی۔ اور ہر جگہ مولانا سے کیساں طور پر دلچسپی لی جاتی تھی۔ مولانا کے انتقال کے بعد یہ احساس تو خود مجھے بھی ہوا تھا کہ والد صاحب کچھ سمجھ کر رہ گئے تھے۔ گو یا مشق سخن کے لئے مصرع طرح باقی نہ رہا تھا اور طبع آزمائی اب غیر طرحی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ یا پرانے کلام سے داد حاصل کرنے کا طریقہ باقی رہ گیا تھا۔ خیر یہ داستان تو بہت طویل ہے مولانا کے لطائف کہاں تک بیان ہو سکتے ہیں۔ دفتر کے دفتر سیاہ کر دیجئے تو بھی ان کی سیاہی کا پورا مفہوم پیش کرنے سے قاصر رہیں گے یہ حکایت جس قدر بیان کی جائے اسی قدر لذیذ اور طویل ہوتی چلی جائے گی۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں مولانا کو کس قدر شامل پاتا ہوں اس کو بیان کر دوں

احمد نامہ کے سلسلہ میں جو عذاب بچہ پر نازل ہوا تھا اس کے بعد بھی والد  
 صاحب کو اطمینان نہ ہوا۔ اور آپ نے عذاب کے ایک مستقل مرتبے یعنی مولانا  
 عبدالرحیم کلیم کے سپرد کرنے کا ہمارے متعلق فیصلہ کر دیا۔ مولانا فارسی کے  
 بہت بڑے فاضل تھے۔ فارسی میں شعر بھی خوب کہتے تھے۔ اور رد سائے مہال  
 فارسی پڑھانے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہ تو سب کچھ درست مگر اس استاد  
 سے تسلیم حاصل کرنا جس کی صورت دیکھ کر خواب تو خواب عالم بیداری میں  
 انسان اچھل پڑے۔ عذاب نہیں تو اور کیا تھا مگر چونکہ ہمارے فارسی اعمال  
 اسی کے مستحق تھے لہذا طے یہ ہوا کہ ہم روزانہ مولانا کے در دولت پر حاضر ہوا کریں  
 اور ان سے فارسی پڑھا کریں اور مصیبت بالائے مصیبت ملاحظہ ہو کہ باہر  
 تو صرف مولانا کا چہرہ ہی نظر آتا تھا۔ گھر پہنچے تو دیکھا کہ آپ ایک برائے نام خرقہ  
 باندھے۔ لال لنگوٹے والے کی جے۔ بول رہے ہیں۔ اور خود ہی اس جے کے مخاطب  
 بھی نظر آتے ہیں۔ ایک دم ڈز سوٹ والا رنگ اس پردہ رخنہ روشن اور ادھر  
 ادھر ہلتی ہوئی گردن بلکہ معاف کیجئے گا یہ تو غلط بیانی ہو گئی گردن تو تھی نہیں۔  
 کندھوں سے چہرہ براہ راست ملا دیا گیا تھا۔ مولانا کو اس عالم میں دیکھ کر سندھو  
 جہازی والا تسمہ پایا و آگیا اور کبھی خیال یہ ہوا کہ الہ دین کا چرلہ تو گل ہو گیا ہے  
 اس کا یہ ڈیوٹ سننا سوکل اب تک موجود ہے نہ معلوم ہم کو کس موت مارے  
 گا یہ مولوی دل سے دعا نکلی کہ اے رب العالمین یہ صاحب خواہ انسان ہوں  
 یا نہ ہوں ہمارا آدنا مہ چین کر درخت پر چڑھ جائیں تو میں پانچ پیسے کی شیرینی  
 پر ابھی نیاز دلوں گا مگر اس قسم کی دعائیں ذرا مشکل سے قبول ہوتی ہیں البتہ

اتنی ضرورت قبول ہوئی کہ مولانا نے ہم کو نہایت شفقت سے بڑھانا شروع کر دیا۔ کسی قسم کی سختی نہیں فرمائی اور جو درہشت ان کی صورت دیکھ کر قائم ہوئی تھی وہ رفتہ رفتہ دور ہو گئی۔ مولانا کا پڑھانے کا طریقہ نہایت دلنشیں تھا اور وہ کچھ اس انداز سے سمجھاتے تھے کہ وہ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں مگر ان کی بات سمجھ میں آ جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی ہمارے لئے پچند ہی دنوں میں آسان ہو گئی۔

## خالو مدن ورن کالال اسکول

مفسر فارسی کے بل بوتے پر زندگی بسر نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ کوئی منلوں کا دربار تو ہے نہیں کہ اس نے اپنے گھریلو علوم میں فاضل ہو کر ابو الفضل بن ہائے والد صاحبہ کو سب سے زیادہ نگر تو یہ تھی صاحبزادے کی عمر بڑھ رہی ہے اور باقاعدہ تعلیم کا کہیں نام و نشان نہیں۔ آخر ان کے کام ان کی ایک بہن آئیں۔ بن کے شوہر ایک بڈل اسکول میں ملازم تھے۔ ہمارے ان خالو کا اسم گرامی تھا سید محمود رضا اور کہلاتے تھے مدن۔ والدہ صاحبہ ان کو صرف مدن کہتی تھیں اور ہم خالو مدن۔ والدہ صاحبہ نے ان بزرگ کو ہمارا مشیر تعلیم مقرر کر دیا۔ اور ہمارے ان خالو مدن نے ایک آدھ حساب کا سوال ہم سے حل کرایا، کچھ اردو پڑھوائی کچھ انگریزی کا جائزہ دیا اور نہایت ناک بھوں چڑھا کر کہہ دیا "نفس"۔ یعنی کچھ بھی نہیں۔ مگر ان کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ لہذا انھوں نے مشورہ دیا کہ ہمارا داخلہ ان کے اسکول میں کر دیا جائے ان کے اسکول کا نام لال اسکول تھا۔ اس لئے کہ وہ سرخ رنگ سے رنگا ہوا تھا اور دراصل چرچ مشین ہائی اسکول کی پانچ تھا۔ خالو

دن اس اسکول میں ماسٹر بھی نہیں بکرمولوی تھے۔ بہر حال ان کا اثر اتنا ضرور تھا کہ ہم  
 باوجود نا لائق تھے ہونے کے چوتھے درجے میں لے لئے گئے۔ اور پہلے ہی سال نہ ملنے  
 کیونکر چوتھا درجہ پاس کر کے پانچویں میں آ گئے۔ اب ایک نیا مرض شروع ہو گیا۔ سینہ  
 میں درد کے دورے پڑنے لگے۔ الا مان و الحفیظ اس قدر شدید درد کہ غذا دشمن  
 کو بھی محفوظ رکھے محفوظ تو خیر ہم بھی تھے۔ مگر درد تھا بڑا خالم ایک تو بہ کہ ٹھیک ہونے  
 دس بجے دن کو شروع ہوتا تھا ۹ بجے اس لئے نہیں کر سکتے تھا کہ لوگ کھانے کو منہ  
 کر دیتے اور دس بجے اس لئے نہیں کہ پھر بعد از وقت ہوتا تھا۔ وہ اسکول کا وقت  
 سحر تھا۔ ۹ بجے کھانا کھا کر کتابیں سنبھالیں، کپڑے پہن کر کھڑے ہوئے اور  
 درد کا دورہ شروع ہو گیا۔ اب کوئی کتابیں سنبھال رہا ہے کوئی شیر دانی اتار  
 رہا ہے کسی نے ٹوپی تقاضی تو کسی نے جو نا اتارا اور ہم کو کسی نہ کسی طرح بستر پہنچا دیا  
 گیا۔ دس بجے ساڑھے دس بجے اور آخر کم ہوتے بولے گیا وہ بجے تک درد ختم۔  
 اور اسکول غائب اب ہم چاہے کھیلیں چاہے چین کی ہنسی بیا میں کوئی پوچھنے والا نہیں  
 پھر لطف یہ کہ عجیب سمجدار علالت تھی انوار کو بھی اس درد کا دورہ نہ پڑا۔ یہاں تک کہ  
 باقی بچوں میں بھی درد کی کوئی شکایت بھی نہیں ہوئی۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ لالہ  
 اسکول میں ایکسٹری ماسٹر پنڈت بھوانا تھے جی دہ حساب پڑھاتے تھے۔ ان حضرات  
 ملنے جانے یہ کیا مرض تھا کہ جتنا پڑھاتے اس سے کہیں زیادہ سوال گھر پر کرنے  
 کر لئے دے دیتے تھے۔ اور سوال نہ کئے جائیں تو اپنے والی پڑی اڑی کر کے  
 وہ ہاتھ رسید کرتے تھے کہ آدمی چکرورتی ہو جاتا ہے۔ اس کے اسی شدید  
 نے ہم کو اس مرض میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس مرض کا تعجب ظاہر ہے

کہ درانداز میں سینکڑوں روپیہ بچونکا گیا والدہ صاحبہ کو مستقل طور پر ہماری  
صحت کی فکر نہ کی۔ اور سہ ماہی امتحان کا نتیجہ جوں کلا تو ہم سوائے اردو اور  
فارسی کے ہر مضمون میں بالوالعزمی سے فیل ہوئے تھے۔ ششماہی میں بھی فیل  
ہوئے اور سالانہ امتحان میں تو کمال ہی ہو گیا۔ جس روز نتیجہ سنایا جانے  
والا تھا مسٹر بینجمن پال نے لڑکوں کو ہدایت کر دی کہ ذرا صاف کپڑے پہن  
کر آئیں۔ اسکول کے منجر آئیں گے۔ اور وہی نتیجہ سنائیں گے۔ چنانچہ سب سے  
زیادہ شاندار لباس ہمارا تھا۔ ہر ایک ہمارے ٹھاکہ دیکھ کر ایکس مرتبہ  
غور سے ضرور دیکھتا تھا۔ مسٹر بینجمن پال نے بھی ہمارے یہ ٹھاکہ دیکھے تو  
ہنس کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے اپنی جماعت میں سب سے اول تم ہی آئیو گے  
ہو۔ مگر نتیجہ جو سنایا گیا تو ہم فیل تھے۔ اسی شاندار لباس کے ساتھ اپنی شاندار  
ناکامی کا مشرکہ ہم نے نہیں۔ ہمارے آنسوؤں نے گھسرا کر سنایا  
خوب خوب روئے۔ دوسرے سال خدا خدا کر کے پاس  
ہوئے اور تیسرے سال پشادرجہ پاس کر کے لال اسکول کو چھوڑ دیا اس لئے کہ اس  
اسکول میں چھٹے درجے ہی تک تعلیم ہوتی تھی۔

## گورنمنٹ ہائی اسکول حیدر آباد

اب ہمارا داخلہ گورنمنٹ ہائی اسکول حیدر آباد میں ہوا۔ حالانکہ ہم بہت  
کمزور تھے اور لال اسکول کے طالب علموں کے متعلق ان باقاعدہ اسکولوں کی  
رائے بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ اس لئے داخلہ میں بڑی دقت ہوئی مگر درپردہ ہوشی سفاکش



سے ساتویں درجہ میں لے گئے۔ اب گویا ہم اچھے خاصے بڑے آدمی تھے۔ ایک بڑے  
 اسکول کے بڑے طالب علم بڑی کتابیں، بڑے بڑے تعلیم یافتہ استاد بہت بڑا  
 کھیل کا میدان، غرض ہر چیز بڑی تھی، اور اسی کے ساتھ شرارتیں بھی بڑی کچھ  
 دن تک تو اسکول میں بھگتی ملی بن کر رہے، اس لئے کہ ایک مڈل اسکول سے آئے  
 تھے۔ اور یہاں کے لڑکے مڈل اسکول کے لڑکوں کو گاؤں دی سمجھا کرتے تھے۔ مگر رفتہ  
 رفتہ ہمارے دوستوں کی بھی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔ اور پھر آخر تک اس جماعت نے  
 حسین آباد ہائی اسکول میں زندگی کی روح بھونکی پڑھنا اور ڈھنسا تو خیر یہاں بھی پڑے  
 نام تھا۔ البتہ تمام مشاغل میں ہمیشہ پیش تھے مثلاً سب سے پہلے اسکاؤٹس ہم تھے  
 کھیل کود کی تمام درخواستیں لے کر ہم مہیڈیا سٹر صاحب کے پاس پہنچے تھے اسکول کے عام  
 غیر تعلیمی ہنگاموں میں سب سے زیادہ ہمارا حصہ تھا، مگر تعلیم! —  
 سخن درانیست شرارتیں اپنے شباب پر تھیں۔ اسکول کے ہر استاد کو معلوم تھا کہ تمام  
 شرارتیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں، مگر کسی کے ساتھ شرارتوں میں کوئی کمینہ نہیں،  
 کوئی چھوٹی بات اور کوئی ایسی بات کبھی نہ ہوتی تھی کہ جس سے اسکول کی  
 عظمت یا گھر لے کر عزت پر حرج آئے۔ اس کے علاوہ ان شرارتوں  
 میں ذہانت کو بھی کافی دخل ہوتا تھا۔ اور ہم تمام دوستوں میں اتفاقاً اس قدر تھا  
 کہ کیا خیال کوئی استاد ہم میں سے کسی کا بھید پالے حسین آباد ہائی اسکول ایک  
 بلند تیلے پر واقع ہے۔ اور اس کے نوازی دوسرے تیلے پر شاہ پیر محمد صاحب  
 کا مندر اور مسجد اور رنگ ہے ان دونوں ٹیلوں کی درمیانی نشیب نہیں  
 ایک مٹر تک ہے ایک مرتبہ ہم لوگ لانا برابر کرنے کیلئے پتھر کا وزنی رولر دھکیل

کر اس ڈھال تک لے گئے جس کے نیچے سڑک تھی۔ اور انجام پر غور کے بغیر محض  
 یہ تماشہ دیکھنے کے لئے کہ یہ دور کس طرح ڈھال پر لڑھکتا ہے۔ اب جو اسے  
 لڑھکاتے ہیں تو اس نے توپ کے گولے کی طرح پہلے تو جا کر نیچے کا ہنگامہ توڑا  
 اس کے بعد سڑک پر جا کر ایک لاری سے متصادم ہو گیا۔ اور لاری کا ایک  
 حقہ چکنا چور کر دیا۔ اس انجام کا وہم و گمان بھی نہ تھا، سمجھتے تھے کہ نہ جیلے  
 کیا گت بنے گا۔ مگر ہیڈ ماسٹر صاحب اس شش و پنج میں تھے کہ اس شرارت  
 کے کسی ایک دوزخ داروں کا پتہ چل جائے تو وہ سزا بھی دیں۔ لاکھ لاکھ  
 تحقیقات کی مگر تمام جماعت نے صرف یہی کہا کہ تصور سب کا یہ ہے اور ہم سب  
 ہی تھے۔ جو نتیجہ اس شرارت کا برآمد ہوا ہے اس کی ہم کو خبر نہ تھی۔ اور اب  
 ہر سزا کے ہم مستحق ہیں۔ آخر مجبور ہو کر تمام جماعت کو مورد الزام قرار دے کر  
 خفیہ سی، بید باز ہو گئی۔ ہم لوگوں نے بعد میں جشن اتھا و منایا جس میں  
 دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ اور ایک دوسرے کو اس اتحاد اور اتفاق پر مبارکباد  
 دے کر ہم لوگوں نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان کی تمام قومی جماعتوں کو چاہیے کہ وہ ہم  
 سے اتحاد کا سبق لیں۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر مولوی زین الدین صاحب ذرا خاموش قسم  
 کے سنجیدہ بزرگ تھے بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ شرارتوں کو پسند نہیں کرتے مگر ان کے  
 بعد میں یہ ہوا کہ وہ شرارت کو طالب علم کا جائز حق بھی سمجھتے تھے۔ بشرطیکہ اس شرارت  
 سے اسکول کے ڈسپان میں کوئی خاص خلل واقع نہ ہو۔ مثلاً خود یہ خاکسار اپنے تمام  
 استادوں کی نقل اتار کر لاتا تھا۔ ان کے لب و لہجہ سے لے کر ان کی کمزوریوں تک  
 کی نقل جو غیر شعوری طور پر سب ہی میں کچھ نہ کچھ ہوتی ہیں۔ اور ان کا احساس اس

وقت ہو سکتا ہے جب کوئی بتائے۔ مثلاً کسی کی عادت ہوتی ہے کہ بکھتے وقت منہ  
 پڑھاتا جائے کسی کو یہ مرض ہوتا ہے کہ زبان نکال کر خوشنویسی کرے اسی طرح  
 مختلف قسم کی عادتیں مختلف لوگوں میں نظر آتی ہیں۔ ہمارے میڈیٹر صاحب  
 کی عادت تھی کہ وہ پڑھاتے وقت دانت سے کچھ ریشے برابر نکالتے رہتے تھے  
 ہمارے سرسری کے استاد ماسٹر کرجی کی عادت تھی کہ وہ ایک دائرے خاص  
 کے ساتھ شانے اچکاتے تھے۔ اور سوال کرتے وقت لب زیریں کو اس طرح باہر  
 نکال دیتے تھے۔ گویا طالب علم کو منہ چڑھا رہے ہیں۔ ہمارے ایک اور استاد  
 غلام جیلانی صاحب تھے۔ وہ تو گویا ہم لوگوں کے نہایت بے تکلف دوست  
 کہتے تھے۔ ان کی کمزوریاں ہم خود ان سے کہہ دیتے تھے۔ مگر وہ کمزوریاں اس قدر  
 زیادہ تھیں کہ وہ بیچارے ان کی اصلاح سے اس عمر میں قاصر تھے۔ ہمارے فارسی  
 کے استاد ابووی فضلی حسن صاحب کے متعلق ہم لوگوں کی رائے یہ تھی کہ ان بیچارے  
 کی موت کئی دن کلاس ہی میں واقع ہوگی۔ اس لئے کہ ان کے پڑھانے کے طریقے  
 اور ورزشیں بہت کم فرق تھا جس کی حالت یہ تھی کہ بالکل چڑیا نظر آتے تھے  
 منہ کی پھنگی پر رکھی ہوئی عینک۔ بغل میں کتابوں کا ڈھیر اور برآمدہ میں اٹل رہے  
 ہیں۔ اس انتظار میں کہ گھنٹہ بجے اور درجہ میں تشریف لے آئیں۔ پھر کیا مجال کہ ایک  
 منٹ بھی نہایت ہو، آتے ہی نعرہ بلند کیا۔ سائنس کے رٹ کو سائنس میں جاؤ فارسی  
 والو آگے بڑھو۔ صفحہ اکتیس نثر۔ خواہندہ مغربی درصفت قرآن ان طلبہ کی گفت  
 کہ اے خداوندانِ نعمت اگر شمارا انصاف ہو میرے دمار قناعت قناعت  
 کیا سمجھے۔ دمار قناعت۔ رسم سوال از جہان بر فاستے پھر سے سنئے، اور یہ سب

کچھ ایک سانس میں، گلے کی رگیں پھول جاتی تھیں چہرہ کے اتار چڑھاؤ سے  
پتہ چلتا تھا کہ اس وقت سیپے کا کم سے کم ایک پیسہ پٹہ علق میں ضرور ہے  
بڑھے آدمی، کمزوری کا حال یہ کہ الفاظ کے تمام جسم کو زبان بنا کر بولتے تھے  
اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ بس اس کے بعد ان کو کچھ نہیں  
کہنا ہے مگر وہ مدتوں اسی شان سے پڑھاتے رہے نتیجہ یہ کہ آخر ہم لوگ جو پہلے  
ان کی زندگی سے مایوس تھے، اب موت سے مایوس ہو گئے۔ اور طے ہو گیا کہ  
یہ مریں گے نہیں۔ بلکہ سو کھ جائیں گے۔ ایسا مذاری کی بات یہ ہے کہ  
حسین آباد ہائی اسکول میں اتنا محنتی اور حلال کی ردی کھانے والا اور  
کوئی استاد نہ تھا۔ جب ان کو یہ اطلاع ہوئی کہ ہم ان کی نقل بھی اتار رہے ہیں  
تو نقل سننے کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔ اور جب نقل سنی تو فرمایا کہ نقل سطلان  
افضل ضرور ہے مگر یہی کہنا پڑتا ہے کہ س

گر حفظِ مراتب نہ کنی زندگی

باقی استادوں میں سے کچھ منہس کر چپ ہو رہے کچھ برامان گئے۔ اور جہاں

تک ہم کو یاد پڑتا ہے ہیڈ ماسٹر صاحب نے یا خان صاحب سید امیر احمد

صاحب نے جو آج کل ہیڈ ماسٹر ہیں اور اس وقت اسسٹنٹ ماسٹر

تھے۔ یہ فرمایا تھا کہ نقل اتارنا بڑی ذہانت کا کام ہے۔

سوشل سکرٹری

اسی زمانہ میں گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں *Students Council*

کی بنیاد ڈالی گئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بڑی محنت سے اس کلب کے لئے قواعد و ضوابط وغیرہ مرتب کر کے ہدیہ داروں کا انتخاب بھی اس کو نہ کہنا چاہئے بلکہ ہدیہ دار خود مقرر کے ہم کو اس کا سوشل سکرٹری بنایا گیا اور ہاؤس ہی زیر اہتمام ایک بہت بڑا جلسہ کیا گیا جو جلد ہی تقسیم انعامات کی رسم کی ایک چیز تھا یہ جلسہ ہم نے ایک سب کمیٹی کی مدد سے اپنے انتظامات کیے ماتحت پچا کا میاں بنا دیا۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے چاہتے انتظامات کی بے حد تعریف کی سوائے اس ایک بڑا انتظامی کے کہ سٹھائی کم پڑ گئی تھی مگر وہ کم پڑھتا ہی چاہئے تھی۔ اس لئے کہ سچ سے اپنی کمیٹی کے ممبران بڑے سٹھائی کا ذائقہ چکھنے میں مصروف تھے کہ کہیں کوئی چیز بد مزہ نہ ہو جس کے بلکہ دس پسند رہ گئے تو ہم سب نے مل کر سمجھیں یہ اندازہ کرنے کے لئے کھسکائے تھے کہ ایک آدمی کو بس یہ حصہ لے گا تو اس کو کھا کر اس کے پیٹ کا کٹنا حصہ بھرے گا۔

## پندرہویں

حسین آباد ہائی اسکول میں ہمارے ایک ہم چارعت پندرہویں تھے۔ ان حضرات کو ہم سب نے اتفاق رائے سے اپنا سالانہ انٹرمیان بیٹھا بھیج دیا ذات شریف تھے۔ یہ بزرگ بھی۔ ہم لوگ ان کو بدو بدو کرنا کرتے تھے اور واقعی بدوؤں کی سی شکل بھی تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ابھی عرب کے ہمارے اچھوت چھوڑ کر یا کسی قافلہ کو لوٹ کر آیا ہے۔ یہ حضرت بھی اسکول میں پڑھے نہیں آتے تھے

بلکہ اسکول کی غیر تعلیمی دیکھچھیوں اور سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے ذمہ دار تھے جو سوچتی تھی نئی سوچتھی تھی۔ اسکول میں اعلان ہوا کہ کل جلسہ تقسیم انعامات کے لئے وزیر تعلیم صاحب تشریف لائے ہیں۔ طالب علموں کو چاہئے کہ ذرا سادہ کپڑے پہن کر آئیں۔ اور نمیز سے رہیں۔ بدوٹے اسی وقت جا کر دوسرے دن کے لئے اہتمام شروع کر دیئے۔ اور دوسرے دن جو ہم لوگوں نے ان کو دیکھا ہے تو کرسی کی سبھی ضبط نہ ہوتی تھی۔ سہرا سترے سے منڈوا یا تھا اس پر تین نہایت اہتمام سے چھڑا تھا۔ اور پہنے ہوئے سوٹ جس وقت ایک انعام کے لئے آپ کو آواز دی گئی ہے آپ نہایت متانت کے ساتھ اسی سیدھی سے وزیر تعلیم صاحب کے سامنے گئے۔ انعام لیا۔ اور تالیوں کی گونج میں واپس آ گئے مگر اس وقت استادوں کا یہ حال تھا کہ ہنسی روکنے کے لئے منہ پر سد مال رکھے ہوئے تھے۔ اور میڈیا سٹر کے منتھنوں کے پھلاؤ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی زبردستی سنجیدگی کی اداکاری کر رہے ہیں۔ اس قسم کی ایک دو نہیں ہزاروں حرکتیں وہ حضرت روز فرمایا کرتے تھے۔ جماعت میں استادوں سے ایک سے ایک جواب قسم کا سوال کر بیٹھتے تھے۔ اور استادوں کو جان چھڑانا مشکل ہو جاتی تھی۔ ایک دن میری بیماری کی اطلاع پا کر عیادت کے لئے تشریف لائے۔ دیر تک بیٹھ رہے تب جانے لگے تو اچھے خاصے تھے۔ صبح کو اطلاع ملی کہ بدو کا انتقال ہو گیا کسی طرح یقین نہ آتا تھا۔ دل نے کہا کہ اس میں بھی کوئی شرارت ہے مگر ایسی خبر اگر یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ہم ابتر علالت پر نہ رہتے اس حال میں ان کے گھر گئے معلوم ہوا کہ شرارت نہیں دانی یہ حادثہ ہوا ہے۔ رات کو



بجائے آیا اور صبح ہوتے ہوتے خستہ، اب ایک سوال یہ تھا کہ اس دن  
شہر میں ہڑتال تھی کہیں کفن دستیاب نہ ہوتا تھا۔ مہر جو م کے نانا صاحب  
نے فرمایا کہ میرے پاس کعبہ شریف کا کفن رکھا ہوا ہے۔ مگر یہ اسے اس لئے  
نہیں دے سکتا کہ پھر مجھے نہ جانے میسر ہو یا نہ ہو۔ ان کی عقیدت کا درجہ  
ٹواہ کیسا ہی بلند ہو مگر اس موقع پر کفن دے دینا بھی اتنے ہی ثواب کا کام تھا  
جیسے وہ کسی استدلال کے باوجود نہ سمجھ سکے آخر ہم یہاں سے ایک صاحب نے  
ایک بڑا بڑا کی دکان کھلو کر کفن حاصل کیا۔ اور اپنے ر سکول اور اپنی جماعت کی  
کی زندگی کو فتن کر آئے۔ بدو کی موت کا میری صحت پر بہت بڑا اثر پڑا اور معمول  
سی بیماری اس حادثہ کے ماتحت ٹول کھینچ گئی

## عشق

اسی زمانہ میں یہ یاد نہیں کہ اس علالت سے پہلے یا اس کے بعد بہر صورت  
اسی دور میں کیونکہ کو بھی اپنا مختہ مشق بنانے کے لئے ہمارا ہی انتخاب کرنا  
پڑا۔ یوں تو بہت دنوں سے اپنی ایک قریبی عزیزہ کے متعلق دل میں کچھ عجیب  
جذبات نشوونما پا رہے تھے۔ مگر اب اس کا اعلان ہی ہو گیا اور ہم نے اپنے  
بھائی جان ارشد تھانوی صاحب سے جو اب ہمارے بہنوئی بھی بن چکے  
تھے۔ اپنے اس انتخاب کا ذکر کر دیا۔ اور اسلئے عسزیرہ (ان کی) کی ہمیشہ  
عزیزہ تھیں۔ ارشد صاحب نے اس سلسلہ میں کوئی گہری دلچسپی نہ لی۔ ان  
کے کہ وہ اس انتخاب کی سختی کے بغیر لبا قائل نہ تھے۔ اور اس کو بھی ہمارا

طفلانہ اور رفتی جذبہ سمجھ رہے تھے۔ مگر یہاں حالات روز بروز شدید ہو رہے تھے۔ اس لحاظ کی پیچاری کا حال تو ہم بوجھام نہیں مگر ہمیں یہ یقین ہو چکا تھا کہ  
 ہونہ جو یہ جذبہ جو ہمارے دل میں پیدا ہوا ہے اسی کو عشق کہتے ہیں اور اگر  
 اس کے نتائج حسبِ دل خواہ نہ ہوتے تو معلوم نہیں ہمارا کیا مشر ہو گا۔ بات  
 اصل میں یہ تھی کہ ہمارے اکثر ساتھیوں کو عشق ہو چکا تھا۔ وہ اپنے قصے برابر سناتے  
 تھے۔ کوئی اپنی محبوبہ کا خط دکھاتا تھا کہ وہ کس طرح ان حضرات کے لئے تڑپ  
 رہا ہے۔ کوئی اپنا خط سناتا تھا کہ میں اپنی سنگیتہ یا محبوبہ کو کیا لکھ رہا ہوں  
 کوئی صاحبِ ایک خشک بھول لئے پھرتے تھے۔ کہ یہ بھول میری محبوبہ نے میرے  
 گھٹ میں اپنے ہاتھ سے محبت کی یادگار کے طور پر لگا یا تھا۔ ہمارے ایک ساتھی  
 تو اس حد تک عاشق تھے کہ وہ ایک نہایت مکر وہ صورت کی مرقوق سی رہی  
 پالے ہوئے تھے۔ اور جب ان سے اس ذوقِ سلیم کی تفصیل دریافت کی  
 گئی۔ تو پتہ چلا کہ یہ بلی ان کی محبوبہ رنواز نے پالی تھی۔ مگر جب وہ  
 پڑوس والے مکان چھوڑ کر چلی گئی تو بلی میرے سپرد کر گئیں۔ کہ اس بلی سے  
 رنگِ لیلے کا لطف حاصل کرنا۔ ان حالات میں ہمارے لئے یہ کیونکر ممکن تھا  
 کہ ہم بے عشق کئے جاتے نہ ہوں۔ ہم سے طبیعت کو جو مناسبت اور ولی کو جو لگا  
 تھا وہ تو خیر اپنی جگہ پر ایک نہایت شریفانہ جذبہ تھا۔ مگر اس نے عشق کی جو صورت  
 اختیار کی تھی وہ یقیناً فیشن کے ماتحت تھی۔ چنانچہ ہمارے اس مشغل کی اطلاع  
 کئی ہمارے دوستوں کو تھی۔ اور وہ ہمارے عشق سے بھی دلچسپی رکھتے تھے  
 اس لئے کہ ہم لوگ آپس میں مل کر آہ و زاریاں کیا کرتے تھے۔ وہ

ہائے گل پکارتے تھے اور ہم راستے دل ہمارے بہت غم پیاری کا ارتقاں پکارتے  
 ہے، خدا ابھی ہم کو معاف کرے اور ان کی روح بھی نہ شرارتے۔ اس لئے کہ  
 اس میں ان کا تو کوئی قصور ہی نہیں، حرکتیں تو سب ہماری تھیں اپنے دوستوں  
 کے سامنے عشق کی دوڑیں ہم بھی اسی سے پیچھے رہنا چاہتے تھے چنانچہ  
 ہم نے بھی خط بگاڑ بگاڑ کر

ان کی طرف سے آپ کے خط ابواب میں  
 اور ان خطوں کو اپنے ان ہزار دوستوں کو دکھاتے تھے جن کے مکتوب  
 محبت ہم دیکھ چکے تھے۔ اور دیکھا کرتے تھے۔ مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ ہم بھی ان  
 سلسلہ میں سرخرو ہو سکیں اور ہمارے متعلق بھی چاہے دوست سمجھ سکیں کہ ہم  
 بھی وہ ہیں جن پر خوبصورت لڑکیاں فریفتہ ہو سکتی ہیں۔

وہی خوبصورت لڑکی فریفتہ ہو سکتی تھی جس کی بصارت میں کوئی خطرناک  
 قسم کا نقص ہوتا۔ اور وہ پیاری لڑکی جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کے تو فرشتوں  
 کو بھی خبر نہ تھی کہ اس کی فریفتگی کے دستاویزی ثبوت اس کے جوہر چچا زاد بھائی  
 اور اس سے شادی کے امیدوار صاحب مرتب فرما رہے ہیں اس کو زیادہ  
 سے زیادہ یہ اطلاع تھی کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری شادی اس کے ساتھ ہو جائے  
 اور تو ہم یہ جعلی خطوط بنایا کرتے تھے اور ادھر ادھر اپنی بڑی بہن  
 خاتون ارشد صاحبہ اور بھائی جان ارشد خاتون نے یہ ضد تھی کہ بس  
 شادی کراہی دیجئے یہاں تک کہ یہ اطلاع والد صاحب کو بھی ہو گئی اور انھوں  
 نے قلعی انکار کر دیا۔ کہ یہ نسبت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ مگر جن کو عشق صادق ہوتا ہے

وہ بھلا ان دیکھیوں میں آتے ہیں۔ ہم تو طے کئے بیٹھے تھے کہ شادی ہوگی اور وہی ہوگی  
 ورنہ کبھی نہ ہوگی۔ اور کہیں نہ ہوگی۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ والدہ  
 صاحبہ نے سمجھایا اور ہم نے جی کڑا کر کے صاف کہہ دیا کہ اگر وہاں شادی نہ ہوئی  
 تو میں خودکشی کر لوں گا۔ اب تو ہمت بڑھ چکی تھی اور عاشق کو ڈر بھی کس بات  
 کا ہو سکتا تھا۔ مصائب کے لئے اگر تیار نہ ہوتے، اختلافات سے اگر مرعوب ہی ہو  
 جاتے تو عشق ہی کیوں کرتے۔ آخر والد صاحب کو بھی ایک خط لکھ دیا کہ اگر  
 میری شادی وہاں نہ ہوئی تو میں خودکشی کر لوں گا۔ والد صاحب نے اپنے ریوالور  
 میں چھ کارٹوس بھرے اور ملازم کو دیا کہ جا کر چھوٹے میاں کو دے آؤ اور کہنا کہ  
 بسم اللہ۔ اس جواب کی امید بھی نہ تھی۔ ریوالور دیکھ کر تو دم ہی تو نکل گیا اور  
 والدہ صاحبہ نے سر پیٹ لیا کہ کیا غضب کیا تم نے وہ اپنی جان دے دے گا  
 مگر پولیس کے منجھے ہوئے ان تجربہ کار بزرگ نے نہایت بے پروائی سے فرمایا  
 کہ تم چپکی بیٹھی رہو۔ جو زبان سے خودکشی کہہ دے، وہ خودکشی کبھی کر ہی نہیں سکتا  
 اور اگر خودکشی کر لے تو سمجھ لینا کہ ٹھکانے لگا۔ اس قسم کے لوگ یا تو بعد  
 میں سدھر جاتے ہیں، ورنہ قتل کے حبرم میں پھانسی پائی کرتے ہیں اور  
 ہم نے کاتیتے ہوئے ہاتھوں سے ریوالور اٹھایا ایک مرتبہ دل مضبوط  
 کر کے ریوالور کی نال کنیٹی پر رکھ کر کلر پرٹھا بلیبی کو ٹوٹا اور پھر کیوڈ حساب  
 سے کہا کہ آپ ذرا اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر لیتے تو اچھا تھا چنانچہ وہ راضی ہو گئے۔  
 ریوالور کنیٹی سے ہٹ کر میز پر آ گیا۔ اور ہم کو محسوس ہو گیا کہ عشق اسی وقت  
 تک دھیسپ مشغلہ ہے جب تک جان جو کھوں کا سوال پیدا نہ ہو ریوالور والد

صاحب کے ہاتھوں میں اور ہم ان کے قدموں میں نظر آئے رہ گئے۔ وہ اب تک لکھنؤ اور بھوپال کے درمیان گولو کے عالم میں تھا مگر رفتہ رفتہ جماسنی تک آیا پھر راولپنڈی پھر کانپور۔ پھر اناؤ اور آخر لکھنؤ۔ ان عزیزہ کی شادی کچھ دن بعد ان کے ایک نانیہالی عزیز کے ساتھ ہو گئی۔ جو ہم سے کہیں بہتر تھے۔ مگر شادی کے کچھ ہی دن بعد وہ بیماری خونیہ میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ جہاں محبت بھی جنگلی جانوروں کی طرح ریوڑوں سے بھاگ جاتی ہے۔ مرنے کی دھمکی کس نے دی اور مر اکون، داعی عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد ہوتا ہے۔ اور مردانگی پر بد شہنی ڈالنے کی غالب ہیں اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔

## طخٹخش احمد

اس عشق سے فارغ ہو کر پھر تعلیم کی طرف متوجہ ہونا تھا اس لئے کہ عاشق تو گویا ضمنی طور پر ہو گئے تھے۔ ورنہ تھے تو طالب علم ہی۔ والد صاحب اس واقعہ کے بعد فوراً چو کنا ہو گئے تھے۔ اور ان کو اب یہ پتہ چل چکا تھا کہ صاحبزادے میں بغاوت کے پوئے آثار موجود ہیں۔ اگر ذرا بھی ان کی طرف سے غفلت برتی گئی تو یہ حضرت نہ جانے کیا گل کھلا بیٹھیں گے۔ لہذا ان کو ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو گھر پر رہ کر ہماری تعلیم اور تربیت کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے لے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک بے بی آسٹن قسم کے بزرگ تشریف لائے۔ مناسباً قدمہ پر چھتر نما نوٹھیں۔ ہمارا ایک جوتا ان کے دونوں پیروں میں اُسکتا

نما، اور ہمارے شیعہ والی پینٹے کے بعد ان کو پا جائے کی ضرورت بھی نہ رہتی سمجھ  
 رہے تھے کہ والد صاحب یہ جاندار کھدونا ہم سے خوش ہو کر ہمارے کھیلنے کے لئے لائے  
 ہیں مگر پتہ چلا کہ یہ قسمت ہمارے آقا ایق مقرر ہوئے ہیں۔ جینے پورے سہنے  
 والے ہیں اتم مبارک بخش احمد ہے۔ غریب خانہ ہی پر قیام فرمائیں گے  
 اور جو بیرون گئے ہم پر نازل نہیں گئے چنانچہ ان بزرگ نے ہم کو اپنی نگرانی میں  
 لے لیا۔ اور ہماری تعلیم اور تربیت شروع کر دی۔ آدمی مختصر سے ضرور تھے  
 مگر اس بچہ سے قدریں بلا کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ بڑے واؤں سچ اور کاٹ  
 چھسانٹ کے بزرگ تھے۔ بچہ باتوں شروع میں آپ نے اپنی ذات سے  
 دلچسپی پیدا کرنے کے سامان کئے۔ ٹینس کھیلنے کا انتظام کیا۔ ریکٹ آئے۔ جال  
 آیا۔ گیند آئے۔ لان درست ہوا۔ اور ہم نے باقاعدہ ٹینس شروع کر دی  
 اس طرح صحبت دوستی ہی ہو گئی تھی اور ہم ان کو پسند کرنے لگے تھے جہاں تک  
 پڑھانے کا سوال ہے اس پر وہ بہت زیا وہ زور نہ دیتے تھے اور پڑھانے سے تو  
 وہ بھی نہایت کھانڈے بن کے ساتھ تاکہ سبق کوئی قابل نفرت چیز نہ بنے  
 بلکہ قابل قبول ہو سکے۔ اس کے علاوہ ان کا یہ طریقہ بھی بہت اچھا تھا کہ ہماری  
 ہر معمولی سے معمولی صلاحیت کی بے حد تعریف کرتے تھے۔ اور کمزوریوں کو جہاں  
 تک ہوتا تھا دبانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا ہر ایک سے یہ کہنا کہ یہ بڑا  
 بلا کا ذہین ہے۔ اس کی ذہانت سے آج تک کام نہیں لیا گیا۔ ورنہ یہ کوئی چیز  
 ہوتا۔ ہم کو زبردستی ذہین اور تعلیم کا شوق بنا رہا تھا۔ خوشنہ پسندی تو خیر فطرت  
 میں تھی ہی۔ اسی دگشتی ہوئی رنگ پر اس سر بخش احمد کی بنیاضی نے ہاتھ رکھ دیا اور آ



وہ یہ پرواہ طالب علم جو اب تک تعلیم کو والدین کا استبداد سمجھا کر ناتھا تعلیم کو اپنا دلچسپ ترین مشغلہ سمجھنے لگا۔ اب کے علاوہ اب ایک پروگرام بن گیا تھا۔ اس وقت سو کراٹھنا۔ اس وقت ناشتہ کرنا۔ اس وقت غپ شب، اس وقت اسکول۔ اس وقت کھیل، گویا زندگی ایک باقاعدگی کے ساتھ ان ماسٹر صاحب نے شروع کرادی، وہ صرف ہماری کتابوں کے ذمہ دار بنتے۔ بلکہ ہمارے لباس پر بھی ان کی نظر پڑتی تھی۔ ہماری غذا کی بھی ان کو فکر ہوتی تھی۔ ہمارے کھیل کو دیکھ کر انتظام بھی ان کے سر تھے۔ والد صاحب کو اب اطمینان تھا کہ صاحبزادے ایک راستہ پر لگ گئے ہیں۔ اور اب کسی نہ کسی دن منزل تک پہنچ ہی جائیں گے۔ ماسٹر بخشش احمد صاحب اس حد تک ہمارے دوست ہو چکے تھے کہ ان کو ہمارے گزشتہ عشق تک کی اطلاع تھی۔ اور وہ بھی کبھی کبھی اس سلسلہ میں بات بھی کیا کرتے تھے۔ اپنے عشق کی کہانیاں سناتے تھے اور اس طرح ہم پر یہ واضح کرتے کہ یہ دراصل عشق نہیں بلکہ عشق کا ایک فاسکارانہ دھوکا ہوتا ہے جس کو انسان یاد تو ہمیشہ رکھتا ہے، مگر یہ یاد بھی تڑپاتی نہیں۔ بلکہ بڑی ذہن میں ایک واقعہ کے طور پر محفوظ رہ جاتی ہے جس پر انسان بعد میں ہنستا بھی ہے۔ اور کبھی کبھی اس سے سبق بھی لیتا ہے۔ ماسٹر صاحب شاعر تو نہیں تھے۔ مگر شاعری کا شوق بہت تھا۔ اکثر شعراء کا کلام بڑا مزے لے لے کر پڑھتے تھے۔ اور ان کے اس مزے سے ہم کو بھی لطف آتا تھا۔ شعراء کو اس قدر مزیدار چیز ہم نے اب تک کبھی نہ سمجھا تھا۔ اب شعر میں ہم کو بھی مزہ آنے لگا تھا اور شعراء کا کلام ہم کو بہت دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ اور اس سے لطف

لیتے تھے۔ ایک دن ہم نے خود بھی شعر کہنے کی کوشش کی۔ اور تھوڑی دیر کی فکر کے  
بعد دو شعر کہے۔

خدا اپنی خدائی کے بس ان کو مجھے دیدے  
میں یہ سمجھوں گا اس نے اک خدائی مجھ کو دیدالی  
میری تخریب سے تمبر کے پہلو بھی نکلیں گے!  
مجھے آراستہ کر دے گی اک دن ان کی پامالی

ماسٹر صاحب کو یہ شعر سنائے تو وہ اچھل پڑے۔ کسی طرح ان کو یقین ہی نہ  
آتا تھا کہ شعر ہم نے کہے ہیں وہ اس کو سرقہ سمجھ رہے تھے۔ مگر جب ان کو یقین ہو گیا  
تو ان کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہوئی۔ اور ایک دم ان کو احساس  
ہوا کہ اس لڑکے میں پوری شاعرانہ صلاحیت موجود ہے۔ بجائے اس کے کہ  
وہ ہمارا حوصلہ پست کرتے ہم کو انھوں نے پورا یقین دلایا کہ تم شاعر ہو شاعر  
کبھی بتا نہیں۔ بلکہ پیدا ہوتا ہے۔ اور آخر ہم کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ چور کبھی چٹا  
نہیں بلکہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ شعرواقعی ہمارے نہیں تھے۔ ایک بہت پرانے  
رسالے سے نقل کر لئے تھے۔ مگر اسی واقعہ نے دراصل ہم کو شاعر بنانا شروع کر دیا

## شوکت تھانوی

ان اشعار کو سننے کے بعد ماسٹر صاحب نے ہمارے لئے تخلص کی جستجو شروع  
کر دی۔ آخر ہم نے خود ان سے کہا کہ ہمارا تخلص شوکت رکھ دیجیئے کہنے لگے بہت  
اچھا ہے یہی سہی۔ چنانچہ اب ہم گھر بیٹو طور پر شوکت ہو گئے۔ اور چونکہ ارشد تھانوی

کی وجہ سے یہ معلوم تھا کہ ہم تھانوی بھی رکھا سکتے ہیں۔ لہذا شوکت تھانوی ہو گئے۔  
 پرانے رسالوں سے شعر نقل کرنے کا سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا۔ مگر اب ایک  
 بات پیدا ہو گئی تھی کہ طبیعت میں شعر سے دلچسپی اور موزونیت کا احساس خود  
 ہم کو ہونے لگا تھا ایک آدمی مصرع کبھی کبھی خود بھی موزوں کر لیتے تھے مگر وہ ہوتا  
 تھا ایسا تھوڑا کلاس کہ اس کو سنائے یا اپنا کہنے کو دل نہ چاہتا تھا ہمارے شاعر نے  
 کی اطلاع ہمارے ہم جماعتوں کو ہو چکی تھی اور ہم ان کو اپنا وہی کلام مجھوم مجھوم کر نہایت  
 خوش آوازی کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔ اور ان پر اپنا رعب جلاتے تھے ہمارے  
 اردو ٹیچر مولوی حفاظت علی صاحب بھی ہم کو نہایت قدر کی نظر دے رہے دیکھتے  
 تھے اور واقعی اس طرح چوری کرنے ہی کے طفیل میں کم سے کم استعداد اتنی بڑھ گئی  
 تھی کہ اور باقی مضامین تو خیر جیسے کچھ بھی تھے۔ ہم کو خوب معلوم ہے کہ اردو میں  
 ہمیشہ اول نمبر پاس ہوتے رہے اور ہماری اردو کی قابلیت ہمارے استادوں  
 اور محنتوں نے ہمیشہ تسلیم کی۔ مگر ایک دن ہماری شاعری کا بھانڈا خوب بھوٹا ہم  
 نے ایک تازہ غزل اپنے احباب کو سنائی اور وہ ہمارے اردو ٹیچر مولوی حفاظت علی  
 تک پہنچی۔ خوب۔ خوب ہم کو داد ملی۔ اور مولوی حفاظت علی صاحب نے ان الفاظ کے  
 ساتھ اعلان کیا کہ بھائی خدا کی دین ہے۔ شاعر تلمیذ الرحمن ہوتا ہے۔ اور شاعری  
 کے لئے کسی عمر یا قابلیت کی قید نہیں وہ جس کو نواز دے۔ مگر دوسرے دن ہمارے  
 ایک ہم جماعت محمد ایوب حسن کینخت جو آج کل اسی لکھنؤ میں سٹی انسپکٹر پولیس ہیں  
 نہ جانے کہاں سے وہ رسالے آئے جس میں وہ غزل چھپی تھی اور وہ رسالہ مولوی  
 حفاظت علی صاحب کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ مولوی صاحب نے اس کو دیکھا

اور بہت ہلنے روکوں نے ہم کو نچو بنالیا۔ اور ہم اب شاعر تو شاعر ایک معمولی انسان کی حیثیت سے بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھے۔ مگر اس زمانہ میں غالباً غیرت داری بھی یوں ہی سی تھی۔ کچھ دن تک اس کا اثر رہا۔ دوستوں نے مذاق اڑائے۔ استادوں نے ذیل کرنے کی پوری کوشش کی مگر ہم ذلیل ہونے پر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ اور ہر خیز کہ ہمارا ستارہ گردش میں آچکا تھا مگر کچھ ہمارے دن کے بعد حالات اپنی معمولی رفتار پر آگئے۔ البتہ اب میری شاعری کا سکہ کھوٹا ثابت ہو چکا تھا۔ اور پھر ہم کبھی یہ جرات نہ کر سکے کہ اپنے کسی ہم جماعت کو اپنا کوئی شعر سنائیں خواہ وہ ہمارا ہی کیوں نہ ہو۔

## پہلی غزل

چھوری کھلنے کے اس واقعہ کے بعد ہم کو واقعی عبرت حاصل ہوئی اور اس سلسلہ میں ہم ایوب صاحب کے ہمیشہ کے رشتہ گزار رہیں گے کہ اس شرارت کبر وہ میں ہم سے بہت بڑی دوستی کی رہنا پنہ ہم نے پھر کبھی کسی شاعر کا شعر نقل نہیں کیا۔ اور خوش شعر کہنے کی کوشش کرتے رہے۔ معلوم یہ ہوا کہ شعر کہنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ گھنٹوں غور کے ایک مصرعہ کہا بھی تو پتہ چلا کہ اس میں ہا تو کچھ گھٹ گیا ہے۔ یا بڑھ گیا ہے۔ اور گھنٹہ بھر اس کی کڑبیونٹا کی باتوں کو بیٹھے مصرعے لکھ رہے ہیں۔ اور کات لے رہے ہیں۔ اور والدین یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کا چوہنار امتحان کی شدید تیاریاں کر رہا ہے۔ اسی زمانہ میں بھائی جان ارشد تھا نوی صاحب تشریف لائے اور ان کو ہمسائے آملیق

ماسٹر بخشش احمد صاحب نے ہماری شاعرانہ صلاحیت کی اطلاع دی تو ان  
کو کسی طرح یقین نہ آیا آپ نے امتحان لینے کے لئے ہم کو ایک مصرعہ دیا ۶  
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا  
اور فرمایا کہ اس پر مصرعہ لگاؤ ہم نے تھوڑی دیر میں اس پر مصرعہ تو نہیں لگایا بلکہ  
اپنے مصرعہ پر اس کو لگا کر مطلع کر دیا ۷

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا  
غناک سیامی رات کی تھی اب اس کا اندھیرا دور ہوا  
بھائی جان نے جو یہ مطلع دیکھا ہے تو میں ان کی خوشی بیان نہیں کر سکتا۔ میری  
کسی صلاحیت پر میرے عزیزوں میں سے کوئی کبھی اتنا خوش نہ ہوا تھا اور خود  
میں خوش تھا کہ اس امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ بھائی جان نے یہ مطلع والد صاحب  
کو بھی سنایا مگر وہ سنی ان سنی کر کے ٹال گئے غزل کی جو ری کھیلنے سے جو دھچکدھچکا ہوا تھا  
اس کی تلافی ہو گئی اور شعر کہنے کی ایک نئی امنگ پیدا ہو گئی۔ اور اس خبر کیچھ دن  
بعد ہم نے ایک پوری غزل کہہ کر کھنٹو کے ایک رسالے کو اس خوشامد کے ساتھ بھیجی  
کہ اس کو چھاپ دیا جائے۔ امید تو نہیں تھی کہ چھپ جائے گی۔ مگر ایک  
دن ڈاک میں ہمسائے نام ایک رسالہ آیا جس پر پتہ لکھا ہوا تھا:

شیخ محمد عمر صاحب شوکت تھانوی، کھول کر دیکھا تو وہی رسالہ "ہاں رسالہ  
کا نام بھی سن لیجئے، ترجمہ نظر کیا پاکیزہ اسم مبارک تھا۔ اس رسالہ کا بھی گریہ  
میں معلوم ہوا کہ ترجمہ نظر ملے۔" لکھنؤ، یہ پورا گویا اس کا تاریخی نام تھا یہ رسالہ  
ماجی محمد مصطفیٰ افغان صاحب اصطفیٰ مالک کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر

کے پیرا تہ نام نکلتا تھا اور اس کے ایڈیٹر گویا مولوی برکات احمد صاحب تھے۔ رسالہ کو الٹ کر دیکھا تو فہرست مضامین ہمارے نام سے جگہ گارہی تھی عجیب اضطراب کے عالم میں رسالہ کے صفحات الٹے پلٹے اور اپنی غزل اور غزل کے ادھر اپنا نام جلی حروف میں دیکھ کر ایک دم ایسا محسوس ہوا کہ گویا زندگی میں کوئی بہت بڑا انقلاب آگیا ہے۔ بار بار غزل کو پڑھتے تھے اپنا نام پڑھتے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے اس روز ہمارے خون میں نمایاں اضافہ ہوا ہوگا۔ آخر ہم نے دوسروں پر اپنی شاعری کا سکہ جانے کے لئے رسالہ کا وہی صفحہ کھول کر گھر میں ایک ایسی جگہ رکھ دیا کہ ہر شخص کی اس پر نظر پڑ سکے۔ اور پھر اس طرح دور بیٹھ کر اس کی تگوانی کرنے لگے جیسے کوئی جہے دان میں روٹی رگڑا کر چوہوں کے پھنسنے کا انتظار کرتا ہے یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس دن رسالہ پر کسی کی نظر نہ پڑی۔ اور ہمارا انتظار بالکل بیکار گیا۔ دوسرے دن ہم نے رسالہ کی جگہ بدل دی۔ اور پھر کائنات میں چارہ لگا کر پھلکی پھانسنے کے انداز سے دور جا بیٹھے۔ سب سے پہلے والد صاحب کی نظر رسالہ پر پڑی اٹھا کر اسے دیکھا۔ دیکھ کر کچھ ٹھٹھکے اور پھر تیقن کے لئے عینک لگا کر بغور اسے پڑھا اور پھر نہایت تشویش کے ساتھ رسالہ کو میز پر رکھ کر والدہ صاحبہ کو آواز دی۔

”ارے میں نے کہا سنتی ہو“

”آواز آئی لا رہی ہوں بیان!“

جواب دیا۔ اجی پان نہیں ذرا یہاں آجاؤ۔

والدہ صاحبہ شریف لائیں تو آپ نے اطمینان سے میٹھ کر کہا۔

”یہ آپ کے صاحبزادے کا کلام ایک رسالہ میں چھپا ہے۔“  
والدہ صاحبہ نے یقین نہ کرتے ہوئے نوں کو کھینچ کر کہا۔ ”ہوں۔“  
والد صاحب نے رسالہ دکھاتے ہوئے کہا۔ دیکھ لو نا۔ فرماتے ہیں  
صاحبزادے کہ۔

ہمیشہ غیر کی عزت تری محفل میں ہوتی ہے  
ترے کوچہ میں ہم جا کر ذلیل و خوار ہوتے ہیں  
سوال یہ ہے کہ آخر یہ جاتے ہی کیوں ہیں۔ اور کس سے پوچھ کر جاتے ہیں۔  
والدہ صاحبہ پیاری نہایت معصوم سمجھیں کہ رٹ کے کی کوئی چوری پکڑی گئی ہے  
گھبرا کر بولیں۔ ”مجھے تو جانے آنے کی کوئی خبر نہیں۔“  
والد صاحب نہیں دیتے۔ اور فرمایا۔ شوق برا نہیں ہے مگر قبل از وقت  
ضرور ہے۔“

ہم دو بیٹھے یہ سب باتیں سن رہے تھے۔ اور اندازہ کر رہے تھے کہ والد صاحب  
اگرچہ اپنی خوشی دلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر دراصل میں بہت خوش  
بار بار رسالہ کو دیکھنا اور پھر رکھ دینا۔ بلا وجہ تو ہو نہیں سکتا۔ مگر اس سلسلہ  
میں والد صاحب نے ہم کو کچھ نہ کہا۔ ہماری یہ غزل بہت سی خوبیوں کی اُٹھینہ والہ تھی  
مثلاً ایک تو اس میں شعری ایسے بلند تھے کہ ہم اپنے منہ سے کیا تعریف کریں۔ دوسرے  
عروض کے بڑے بڑے کمالات ان میں موجود تھے۔ مثلاً مقطع ملاحظہ ہو۔  
شفایاتے ہوئے ان کو نہیں دیکھا کبھی شوکت  
جو عشقِ مرضِ ہلک کے کبھی بمبار ہوتے ہیں۔



تخیل کی بلندی پر غور نہ کیجئے اور نہ اس طبی مسئلہ کو میڈیکل کونسل کے سامنے لانے کی فکر کیجئے کہ عشق کے بیمار شفا یاب کیوں نہیں ہوتے۔ بلکہ اس میں فقط "مرض" کے حسن کو ملاحظہ کیجئے کہ کس حسن سے نظم ہوا ہے۔ مرض بفتح اول و دوم سب ہی استعمال کرتے ہیں۔ مگر "شاعر ترجمہ" نظر ملبدہ لکھنؤ نے مرض کی اسے کو بیض بنا کر استعمال کیا ہے۔ یہ کمالات اب کہاں نظر آتے ہیں۔

## بارود کو دیاسلانی

اس غزل کے چھپنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری تمام ادبی صلاحیتیں ایک مرتبہ انکڑائی لے کر سیدار ہو گئیں۔ اب غزل پر غزل کہنے لگے۔ اور بڑے غزلوں کے ترجمہ نظر کا دفتر یاٹ دیا۔ کبھی کبھی کوئی غزل چھپ جاتی تھی اور باقی ردی کی ٹوکری میں پہنچ جاتی ہوں گی۔ ترجمہ نظر کا قائل ہم کو جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اس لئے کہ اس میں ہمارا کلام چھپا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں ہماری واحد و پسی ہی ادبی انتہاک تھا۔ غزلیں کہنے کے علاوہ ترجمہ نظر کے افسانے بڑھ کر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم خود کیوں نہ کہانیاں لکھیں۔ چنانچہ بہت دُرتے دُرتے ایک افسانہ لکھ کر ترجمہ نظر کو بھیجا اور ہم کو تعجب ہوا کہ وہ افسانہ من و عن چھپ گیا۔ دوسرا افسانہ تیسرا افسانہ اور چوتھا افسانہ ہر افسانہ چھپ جایا کرتا تھا۔ لیجئے شاعر تو تھے ہی افسانہ نگار بھی بن گئے۔ اور ہماری ادبی زندگی کا یہ چین نہایت طوفان خیز انگلوں کے ساتھ پروان چڑھنے لگا۔ رہ گیا پڑھنا لکھنا وہ یہ نہیں برائے نام تھا یہ تو سب دیکھتے تھے کہ ادھی ادھی رات تک ہم کھڑے کھڑے ہیں

مگر یہ کسی کو کیا معلوم کر کیا لکھ رہے ہیں۔ اسی زمانہ میں ہم نے اپنے اسکول دوستوں کے لئے ایک قلمی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ اس رسالہ کو خود نہایت خوشخط لکھتے تھے۔ اس میں کارٹون بھی تھے نطیں ہوتی تھیں۔ اور احباب پر چوٹیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ قلمی رسالہ حلقہ احباب میں بہت مقبول تھا۔ اس کا ہر نمبر جو صرف ایک ہی ہوتا تھا احباب کے یہاں ایک ایک دن وہاں رہتا تھا اور گشت ختم کر کے پھر ہمارے پاس آجاتا تھا۔ پندرہ دن کے بعد دوسرا نمبر نکلتا تھا۔ مگر اس کے غائب ہونے پر پانچ نمبر نکل سکے۔ مختصر یہ کہ اسکول میں بھی یہی مشغلہ تھا اور گھر پر بھی یہی۔ والدین کیچہ پڑھ رہے تھے۔ اور بلند اقبال کیچہ پڑھ رہے تھے۔ میں چیمبرائیم و تنبورہ من چیمبرائیم شادی کا ذکر

تعلیم سے فراغت کا آخر کہاں تک انتظار کیا جاتا۔ ارمان بھری ماں بیٹے کا سہرا دیکھنا چاہتی تھی۔ اور باپ کو جس طرح گھر کی کسی اور بات کی فکر نہ تھی اسی طرح بھولانے کی طرف ہی غافل تھے۔ آخر والدہ صاحبہ نے والد صاحب کو راضی کر لیا۔ کہ اب لڑکے کی شادی کر دی جائے۔ والد صاحب بھوپال والے واقعہ اور اس سلسلہ میں اپنی سختی کو بھولے نہ تھے۔ بلکہ اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ حکم دے دیا کہ صاحب زادے دور اور نزدیک کے رشتہ داروں کے یہاں جائیں۔ اور خود یہ بتائیں کہ وہ کس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم اپنے نانیہاں ملاوان ضلع ہر دوی بھیجے گئے وہاں ہماری خالہ تھیں۔ اور ان کی تین لڑکیاں تھیں۔ ہمارے نزدیک انتخاب کا کوئی

سوال ہی نہ تھا۔ شادی کے لئے صرف لڑکی ہونی چاہئے تھی۔ جو بظاہر لولی  
 لنگڑی وغیرہ نہ ہو۔ اور زیادہ تر مطلب تو اس بات سے تھا کہ  
 ایک عورت اپنی تمام امیدیں ہم سے وابستہ کر کے ہم کو اپنا مالک و مختار بلکہ  
 مجازی حنہ را بنالے شادی کا تصور اب نئی صورت میں ہمارے سامنے  
 تھا کہ ایک عورت ہو۔ جو بھولوں میں لدی عطر میں بسی پانڈان کھولے اپنی  
 لمبی لمبی انگلیوں سے ہمارے لئے پان بنا رہا ہے اور دوپٹہ کی اوٹ  
 سے ہم کو دیکھتی جاتی ہے۔ اپنا سمجھ سمجھ کر اور اپنے کو ہماری سمجھا سمجھا  
 کہ لوگ اس عورت کو ہماری بیوی کہہ رہے ہیں۔ اس عورت کے گھر والے  
 ہم کو دو لہا میاں سمجھ رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ شادی سے زیادہ ہم کو اس اقتدار  
 کی تمنا تھی۔ جو شوہر بن جانے کے بعد ایک انسان کو حاصل ہوتا ہے سسرال  
 کی آؤ بھگت، سایوں کا حسین مذاق، ساس اور سسر کی نیاز مندیوں سسرال  
 کے دوسرے عزیزوں کی پرستاریاں ان سب کا انتظار تھا۔ چنانچہ ہم بلاوان  
 گئے۔ اور ان میں سے ایک لڑکی پسند کر آئے اور راسے شیخی کے وہاں کہہ بھی آئے  
 کہ ہم اس گھر کو اپنی سسرال بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ گھر آکر والدہ صاحبہ کو  
 اپنے انتخاب کی اطلاع دی، والد صاحب نے سنا تو وہ اس فیصلہ سے  
 مطمئن نہ ہوئے۔ بلکہ والدہ صاحبہ کو سمجھا دیا کہ فیصلہ جلد بازی کا ہے ان حضرات  
 کو باقی عزیزوں کے یہاں بھی بھیجا جائے تاکہ یہ اطمینان سے کوئی فیصلہ کر لیں۔  
 لہذا ہم اب کی مرتبہ میں پوری بھیجے گئے۔ جہاں ہمارے ایک قریبی رشتہ کے خال زاد  
 بھائی حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب مشن ہائی اسکول میں عربی اور فارسی کے

انچارج بھی تھے اور مطلب بھی کرتے تھے۔ یہاں ہم جن صاحبزادی کو دیکھنے آئے  
 تھے ان کو دیکھ کر آنکھوں کا نور اور دل کا سرور حاصل ہوا۔ طبیعت باغ باغ  
 ہو گئی۔ اور ملاوان جا کر جو فیصلہ کیا تھا اس پر اپنے احمق ہونے کا سچے دل سے  
 اعتراف کیا۔ ایک عجیب گڑیا سی لڑکی بھولا بھولا چہرہ پیاری پیاری باتیں پر بھی  
 لکھی نمازی پر ہر کار سنسنی دے تو منہ سے پھول جھوٹنے لگیں روئے تو۔ مگر روئے  
 اس کی بلا۔ دور پار چھپائیں بھوٹیں۔ مدعا مختصر یہ کہ دل نے کہا کہ اے میاں شوکت  
 اگر یہ بن جائے تو تمہاری دہن تو کیا کہنا ہے زندگی سدھر جائے گی۔ گھر میں لکشمی آجائے  
 گی۔ غریب آدمی کی لڑکی ہے۔ تم بھی غریب زادے ہو۔ مگر رزق دیکھو کہ تم تو صورت سے  
 فقیر معلوم ہوتے ہو۔ اور یہ تخت طاؤس نظر آرہی ہے۔ کیا وقار ہے کیا تمکنت  
 ہے معلوم ہوتا ہے کسی صوبہ کی گورنری کا چارج لے کر بادرچی خانہ میں ماش کی  
 وال دھورہ ہی ہے۔ آنکھوں کو دل کی اس رائے سے پورا پورا اتفاق تھا اور دماغ  
 ان تدابیر پر غور کر رہا تھا کہ کیونکر اس تسلی کو پکڑا جائے۔ ایک دن کے ارادے  
 سے آئے تھے۔ مگر تین دن رہے اور تین دن اس طرح ختم ہو گئے۔ گویا تین چٹکیاں  
 کوئی بجائے۔ اپنی آنکھوں میں ان کو بکرا اپنے دل میں ان کو زخاں لکھنوا آگئے اور  
 والدہ صاحبہ سے کہہ دیا کہ اب کمرتبہ ہم نے واقعی آپ کے لئے بہو ڈھونڈ لی  
 ہے۔ اور ہمارا یہ انتخاب آخری اور قطعی ہے، والدہ صاحبہ نے ہم کو چل ہٹا  
 کہہ کر اس مرتبہ بھی معتبر نہ سمجھا۔ اس نے کہ ہم ملاوان گئے وہاں سے آکر رضامندی  
 ظاہر کر دی۔ مین پوری گئے وہاں سے آکر اپنی پسند کا اظہار کر دیا۔ آخر  
 وہ بیپاری ہماری کس پسند کو قابل اعتبار سمجھیں مگر پچھہ دن تک جب ہم کو اس

سلسلہ میں مستقل مزاج پایا اور ہماری پسند کے علاوہ ایک خاص بے قراری کا اندازہ کیا تو والد صاحب سے کہہ کر ہمارا باقاعدہ پیغام میں پوری بھیج دیا گیا وہاں سے جواب آگیا کہ شادی میں تو کوئی عذر نہ ہوتا مگر پہلے بڑی رٹ کی کا عقد ہو جائے اس کے بعد مٹھیل کی نسبت پر غور کیا جائے گا۔ دوسرے رٹ کا کم سے کم انٹرنس تو پاس ہو جائے یا

## دارٹھی

شادی کے سلسلہ میں تو ہمارے بزرگ خط و کتابت کرتے رہے ادھر ہم اپنے ادبی اور برائے نام تعلیمی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ اس زمانہ میں تحریک ترک موالات کا بہت زور تھا۔ اسکولوں کے بائیکاٹ ہو رہے تھے۔ ہمارے اسکول میں بھی اس تحریک نے روز پکڑا۔ مگر خیر تعلیم تو ہم کیا چھوڑتے مگر کچھ نہ کچھ تو چھوڑنا چاہئے ہی تھا۔ لہذا ہم نے معلوم نہیں کس اثر کے ماتحت دارٹھی چوڑی، سر کے انگریزی بال خشکی کرالئے، گاڑھے کے لمبے کرتے بنوائے، گاڑھے کے پاجامے اور گاڑھے کی ٹوپی۔ پیر میں خاص گنوار دھوتا اور اسی سبب دھج سے اسکول جانے لگے۔ کچھ دن تک لوگوں کو تشویش رہی کہ شاید دماغ پر کوئی ناگوار اثر پڑ گیا ہے پھر لوگوں نے مہنسنا شروع کر دیا مگر یہاں گھٹا کی عقل اور دارٹھی بڑھا کی

تھوڑے ہی دنوں میں اچھی خاصی نورانی دارٹھی چہرے پر اہلہانے لگی ہم کو اتنا ضرور یاد ہے کہ یہ انقلاب سیاسی ماحول کے ماتحت ضرور ہوا تھا مگر اس

کا کسی سیاسی دھبے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جو کچھ بھی ہوا۔ اسی وضع قطع کے ساتھ ایک سال کا زمانہ گذرا پھر رفتہ رفتہ اپنے قریبی پر آنے لگے کھدر کا کرتا چھوڑا قمیض پہنی شیروانی کا اضافہ کیا۔ کھدر کے پا جانے کی جگہ چھانٹین کے پا جانے استعمال کرنے لگے۔ اور اسی طرح طبیعت رو بصحت ہوتے ہوتے مکمل طور پر صحتیاب ہو گئے مگر وارثی اپنی جگہ پر قائم تھی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وارثی شادی کرنے کے لئے رکھی گئی تھی۔ اس لئے کہ حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب ایک مستند عالم ہی نہیں بلکہ علمی طور پر نہایت پکے مسلمان تھے۔ خود ان کے چہرے پر جو وارثی تھی ویسی وارثیاں سرسید کے بعد ذرا مشکل سے نظر آتی ہیں مگر لوگوں کا یہ خیال غلط تھا یہ وارثی شادی کے سلسلہ کی کوئی چیز نہ تھی۔ اور نہ سسرالی اثر کے ماتحت تھی۔

## شادی

آخر کار ہائے بزرگوں نے حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ آپ نکاح کر دیجئے۔ لڑکی کو رخصت نہ کیجئے گا تا وقتیکہ آپ کی شرط پوری نہ ہو جائے۔ یعنی لڑکا انٹرنس پاس نہ کر لے۔ اور اس کے علاوہ ان پر ایسا نذر دیا گیا کہ وہ بچا سے بڑی لڑکی کے عقد سے پہلے ہی منجھلی لڑکی سے عقد پر راضی ہو گئے۔ اتفاق سے اس زمانہ میں حکیم صاحب قبلہ کا تمام خاندان لکھنؤ آیا ہوا تھا۔ اور حکیم صاحب کے برادر عزیز مولوی محمد عثمان صاحب احمدی کے یہاں سب مقیم تھے۔ یہ ہوا کہ یہیں عقد ہو جائے پھر رخصتی باقاعدگی کے ساتھ

ہوتی رہے گی یہ واقعہ ہے کہ مسئلہ نکاح چنانچہ دو دن تاخیر سب طے ہو جانے کے بعد نہایت سادگی کے ساتھ ہم خود ماموں صاحب اور والد صاحب کے ہمراہ رحمت منزل احاطہ قائم فقیر محمد خاں پہنچے۔ اور خود ہمارے خسر صاحب نے ایک قری مسجد میں اپنی صاحبزادی کا نکاح ہمارے ساتھ پڑھ دیا۔ اس وقت دولہا کے چہرے پر ڈاڑھی تھی اور غالباً اسی وجہ سے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہ ڈاڑھی کی ہی کرامت ہے کہ حکیم صاحب قبلہ نے انٹرنس پاس ہونے کی سخت مشرت اور بڑی لڑکی کے عقد ہونے کی تمام رکاوٹوں کے باوجود اس ڈاڑھی کے زیر سایہ عقد پڑھ دیا۔

یعنی صاحب شادی بھی ہو گئی، اور میں پوری کی اسی سا خرہ کے ساتھ شادی ہوئی جس کے لئے اس قدر بے قرار تھے۔ سعیدہ سجاد اب مسر سعیدہ شوکت تھانوی ہو گئیں۔ مگر اب تک ہم دونوں کے درمیاں وہ شدید پردہ تھا کہ کسی نا محرم سے وہ اس قدر چھپائی باتیں ہوں گی۔ مگر اب چونکہ ہماری آمد و رفت رحمت منزل میں بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اب ایک آدھ جھلک ہم بھی ان کی دیکھ لیتے تھے جو ہماری تھیں۔ اب تک تو صرف یہی تمنا تھی کہ وہ ہماری ہو جائیں۔ مگر اب یہ سمجھن کہ ہماری ہو کر بھی ہم سے دور ہیں۔ آخر یہ کیا تماشہ ہے مگر ساتھ ہی ساتھ یہ اطمینان بھی تھا کہ

عقد جب ہو چکا ہے تو اب انشاء اللہ  
کچے دھلکے میں چلی آئیں گی سرکار بندھی



## ایک حادثہ

اسی زمانہ میں علی گڑھ کالج کی جو بی منالی جا رہی تھی۔ اور والد صاحب قبلہ علی گڑھ گئے ہوئے تھے وہاں آپ نے یکایک یہ رائے قائم کر لی کہ ہم کو علی گڑھ ہی میں داخل کر دیا جائے چنانچہ ہم کو علی گڑھ سے تار دیا کہ تم فوراً آ جاؤ اور جو بی اور جو بی کے جشن کی سیر کرو۔ تار ملتے ہی ہم علی گڑھ روانہ ہو گئے، علی گڑھ رات گئے پہنچے۔ اور سیدھے اسی ہوشل میں پہنچے جہاں والد صاحب مقیم تھے آپ وہاں اپنے کسی دوست کے صاحبزادے کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے جو علی گڑھ میں قانون کا مطالعہ کر رہے تھے چنانچہ جس وقت ہم پہنچے وہاں والد صاحب نے فرمایا کہ تم اپنا بستر بندھا رہنے دو۔ میرے دوست کے لڑکے میاں حلیم کا یہ بستر بچھا ہے اسی پر سو رہو۔ وہ کسی کانفرنس میں گئے ہوئے ہیں۔ اور غالباً بہت دیر میں آئیں گے وہ اگر دوسری چارپائی کا انتظام کر لیں گے۔ اور تمہارا بستر بچھا کر سو رہیں گے چنانچہ ہم نے اس حکم کی تعمیل میں حلیم صاحب کے بستر کو اپنا لیا اور سو گئے مگر ابھی غالباً نیند آئی ہی تھی کہ خواب میں دیکھتے کیا ہیں کہ ہم علی گڑھ آئے ہیں اور والد صاحب نے ہم سے وہی باتیں کہی ہیں جو ہم انہی بیان کر چکے ہیں۔ لہذا ہم سونے کی نیت کرنے سے پہلے غسل خانہ گئے ہیں تاکہ ضروریات سے فارغ ہو لیں اور ضروریات میں سے صرف ایک ضرورت سے گویا ہم فارغ ہوئے یہ یکایک آنکھ کھل گئی۔ حلیم صاحب کا تمام بستر تر تیر خود ہم اپنی اسی ضرورت میں ڈوبے ہوئے۔ دم ہی نکل گیا کہ یا اللہ اب کیا ہوگا پرایا بستر علی گڑھ کی فضا ہمارے یہ عمر چہرے پر نورانی وار بھی شادی شد

اور یہ بچوں کی سی حرکت کر اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو ہی چکا تھا اور سوال یہ تھا کہ آخر کریں تو کیا کریں۔ سر دی میں اس قدر جلد بستر خشک نہیں ہو سکتا تھا۔ بستر سے اٹھتے ہیں تو سر پر والد صاحب سو رہے ہیں ان کو خبر ہو جائے گی جس قدر غور کرتے ہیں اسی قدر رسوائی کے امکانات واضح ہوتے جاتے ہیں۔ بھاگ سکتے نہیں۔ آسمان و در اور زمین سخت والا معاملہ تھا نتیجہ یہ کہ ساری رات اسی فکر و تردد میں گزری کہ تقریباً ساڑھے چار بجے سلیم صاحب کا نفرین سے واپس آئے۔ ہم نے اسی عالم میں کہا، "اسلام علیکم" آپ عین وقت پر آ گئے۔

علیم صاحب نے نہایت اخلاق سے کہا، "کیوں کیوں خیریت" عرض کیا، "سر دی میں بستر چھوڑنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے اور پیاس ہے کہ گویا آج لگ کر پھر نہ گئے گی۔"

علیم صاحب نے فوراً ایک گلاس پانی ہم کو دے دیا مگر وہ ابھی دینے بھی نہ پائے تھے کہ ہم نے دی گلاس بستر پر الٹ لیا۔ اور "اے" کا نعرہ بلند کر کے کھڑے ہو گئے، علیم صاحب نے اس کو اپنی غلطی سمجھ کر ہم سے معافی مانگی اور ہم نے فرحزدلی سے کام لے کر ان سے کہہ دیا کہ کوئی ہرج نہیں۔ میرا بستر موجود ہے اس کو بچھائے لیتے ہیں۔ اور دونوں اسی پر سو رہیں گے۔

رسیدہ بود بلائے دلی بخت گزشت

یہ ترکیب پہلے سے ذہن میں نہیں آئی تھی بلکہ علیم صاحب کی صورت دیکھتے ہی ایک دم یہ پلاٹ ذہن میں آگیا اور جان بچ گئی۔ ورنہ علی گڑھ میں تو تالی پٹ جاتی بلکہ والد صاحب بھی وہیں تھے۔ تالی تو تالی ہم خود بھی پٹ جاتے۔

## جوبلی کی سیر

جوبلی میں اپنے بہت سے دوست مل گئے۔ امین سلونوی۔ وصل بلگرامی۔ پیراڈ  
فدا حسین، ساغر نظامی اور مولانا سیما ب وغیرہ۔ ساغر صاحب تو سیما ب صاحب  
کمپنا نہ بک اسٹال میں پھنسے ہوئے تھے۔ امین سلونوی اور وصل بلگرامی مرحوم  
ہمارے ساتھ رہے۔ وصل بلگرامی نے وہاں کے ڈائٹنگ کمیپ میں اپنا کچھ  
ایسا سوخ پیدا کر لیا تھا کہ منتظین خود ان کو منتظم سمجھتے تھے حالانکہ کسی سے وصل  
صاحب پہلے سے واقف نہ تھے پہلی ہی مرتبہ کھانا کھانے گئے تھے کہ یکایک  
کسی بدانتظامی پر ایک دم بچھڑ گئے اور منتظین کو ڈانٹنا شروع کر دیا کہ اگر یہی حال  
ہے تم لوگوں کا تو تم ہم سب کو بدنام کر دو گے لاؤ ادھر سے بیٹیں۔ میں ادھر  
لگاتا ہوں۔ صرف دو رضا کار ادھر بچیدو۔ باقی اس طرف کا انتظام تم دیکھو  
میں یہاں موجود ہوں اس دعویٰ اور اس استحقاق کے ساتھ ظاہر ہے کہ کوئی  
غیر متعلق آدمی احکامات دے ہی نہیں سکتا تھا نتیجہ یہ کہ وصل صاحب کے  
اشاروں پر امین صاحب کی ہدایتوں پر اور ہمارے احکامات پر ڈائٹنگ کمیپ  
کے تمام لوگ ناچے ناچے پھرتے تھے جس کو جہاں چاہا تعینات کر دیا جس سے  
جو کام چاہا لے لیا۔ اور پھر رطف یہ کہ سات روز تک صبح اور شام دونوں وقت  
اچھے سے اچھا کھایا۔ اور چونکہ ہم خود منتظم تھے۔ لہذا قیمت کا کوئی سوال ہی نہیں  
بلکہ ایک مرتبہ تو ہم نے ایک دوست کی اسی ڈائٹنگ کمیپ میں دعوت بھی کر دی  
اور کچھ خرچ بھی نہ ہوا۔ کھانے کی طرف سے یہ انتظام حسبِ دلخواہ ہو ہی گیا

تھا لہذا بے فکری کے ساتھ جشن کی مختلف تقریبات میں حصہ لیتے رہے۔ اور  
جوبلی کا وہ تاریخی مشاعرہ بھی دیکھا جس کے بعد سے شاعر علی گڑھ کا نام سن کر احتجاج  
قلب میں مبتلا ہو جاتے ہیں عجیب طوقان خیز مشاعرہ تھا۔ نواب صدر یار جنگ  
بہادر مشاعرہ کی صدارت کر رہے تھے۔ خواجہ مسعود علی صاحب ذوقی مشاعرے کے  
سکرٹری تھے۔ ہر طرح کوشش کی جا رہی تھی۔ کہ کسی طرح طلباء اپنی ذہانت کا تختہ  
مشق شعرائے کرام کو بنائیں۔ مگر توبہ کیجئے کہیں علی گڑھ کے رٹکے ماننے والے تھے  
ایک صاحب نے خواندگی سے قبل فرمایا کہ حضرات میں صرف تین شعر پڑھنا  
چاہتا ہوں۔ سکون سے سن لیجئے، مشترکہ آواز آوالی، ارشاد، شاعر نے مطلع پڑھا  
تو داد کے بجائے پورا پنڈال بیچ اٹھا، ایک، دوسرا شعر پڑھا تو سب نے ہم آواز  
ہو کر کہا، دو، تیسرا شعر پڑھا تو سب نے نعرہ بلند کیا، تین، چوتھا شعر پڑھنے کا ارادہ  
ہو گیا تھا کہ لائٹ گل۔ اور ایک ہلڑا ایک اور مشہور استاد گلوبند باندھے ڈانس  
پر تشریف لائے۔ سکرٹری نے تعارف کرایا تو ایک آواز بلند ہوئی، حضرت کا منہ کدھر  
ہے، اور واقعی گلوبند اس شان سے بندھا ہوا تھا کہ بغیر تباہ منہ کا پتہ چلنا و شوار  
تھا۔ ایک بزرگ نے غالباً یہ ترکیب مناسب سمجھی کہ اگر میں نعتیہ کلام پڑھوں گا تو کسی  
کو تمسخر کا موقع نہ ملے گا۔ لہذا آپ نے پہلا ہی نعتیہ مطلع پڑھا کہ کسی نے پکار کر کہا، اس کا  
اجرا آپ کو خدائے کا تشریف رکھئے، مختصر یہ کہ کوئی شاعر ایسا نہ گیا جو کوئی ریمارک  
لے کر واپس نہ آیا ہو بہت سے شاعروں نے اپنا کلام سناتے سے ڈر کر کر دیا۔ اور جو  
ایسے ہی بے چین تھے، وہ ڈانس پر گئے۔ اور کچھ نہ کچھ سن کر واپس آئے اس مشاعرے  
کے بعد سے علی گڑھ کی یونیورسٹی کے مشاعرے بہت نام ہو گئے تھے، مگر رفتہ

رفتہ یہ اثر ختم ہو گیا۔ اور پھر کسی مشاعرے میں شعرائے کرام کے ساتھ  
یہ سلوک نہیں ہوا۔

## علی گڑھ سے واپسی

علی گڑھ سے واپسی کے بعد علی گڑھ کا کورس خرید لیا گیا۔ اور خاص طور پر امتحان  
کی تیاریاں ہونے لگیں۔ طے یہ ہوا تھا کہ ایک سال تک گھر ہی پر پوری تیاری  
کر کے ایک دم علی گڑھ سے پرائیوٹ طور پر امتحان دے دیں گے۔ اس مرتبہ ہم  
سنجیدہ تھے۔ اس لئے کہ اب ذمہ داری کا احساس بھی بڑھ رہا تھا۔ اور سنجیدہ  
اور اپنے درمیان سے اس انٹرنس والی شرط کو بھی ہٹانا تھا۔ لہذا زندگی میں  
پہلی مرتبہ سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ ادھر ادھر جا کر پڑھنا چونکہ تمام مضامین  
سوائے اردو فارسی اور انگریزی کے بچہ کمزور تھے خصوصاً ریاضی۔ لہذا بہت  
محنت محنت کرنا پڑی رات رات بھر جاگتے تھے۔ دن دن بھر محنت کرتے تھے۔ یہاں تک  
کہ جب پوری طرح خود اپنے اطمینان کے قابل تیار ہو گئے۔ تو یکایک بیمار پڑ گئے بیمار  
ایسا اور جم کر رہ گیا۔ اور نہایت خطرناک طریقہ پر ٹیسر بڑھنے اور گھسنے لگا یعنی دن بھر کم  
اور شام کو زیادہ، ایک مہینہ اسی طرح ہو گیا۔ دوسرا مہینہ گزرا۔ اور آخر کار ڈاکٹروں  
نے یہ خبر سنا دی کہ دق ہو چکی ہے۔ لڑکے کو بھوانی سیننی ڈریم بھیجا جائے۔ والدین کے  
ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مگر فان بہادر ڈاکٹر عبد الحمید صاحب اس رائے سے متفق  
نہ تھے۔ اور وہ اب تک کبھی مختلف معائنے کر رہے تھے۔ کبھی تھوک دیکھتے  
کبھی خون اور کبھی ایک سرے کرتے آخر ایک دن انھوں نے فرمایا کہ رات  
کے بارہ بجے ان کا خون نکالا جائے پھر اس کو دیکھوں گا۔ چنانچہ رات

کے بارہ بجے یہ "شب خون" ہوا۔ اور دوسرے دن ڈاکٹر صاحب کے معائنہ کے لئے بھیجا گیا۔ سہ پہر کو ڈاکٹر صاحب بغیر بلائے خود ہی آگئے ان کے چہرے پر اس وقت اسے خوشی کے چلچلے پانچوٹ رہا تھیں۔ آتے ہی آپ نے تسرہ بلند کیا۔ "میسری رائے صحیح نکلی"۔ "دق ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اس مرض کا نام ہے فائریا (FILARIA) اور اس کے حیرانہ رات کے بارہ بجے خون میں گردش کرتے ہیں۔ دن بھر تلی میں جیسے بیٹھے رہتے ہیں۔ یوچھا کہ یہ کیا مرض ہوتا ہے معلوم ہوا کہ اس سے گھینگھا نکل سکتا ہے۔ نیل پا ہو سکتا ہے۔ وغیرہ۔ مگر اس کا علاج ہو جائے تو کچھ نہیں ہوتا۔ یہ حضرت کبھی گورکھپور کی طسرف گئے ہیں اور وہاں سے یہ مرض لگا لائے ہیں۔ ہم واقعی گورکھپور کی طرف کیا معنی خود گورکھپور گئے تھے۔ اور وہاں صاحب بلگرامی کے یہاں سے یہ مرض لے کر آئے تھے۔ چپتا پنڈت اب مرض کی تشخیص ہو جانے کے بعد علاج بالکل آسان ہو گیا۔ کلکتہ سے انجکشن منگائے گئے اور تقریباً پچیس تیس انجکشن ہوئے ہوں گے کہ ہم صحت یاب ہو گئے۔ البتہ اس سلسلے میں یہ سال خراب ہو گیا۔ اور تیار ہی کر چکنے کے باوجود امتحان نہ دے سکے۔ اس علالت کا فائدہ یہ ضرور پہونچا کہ وارڈھی منڈ گئی۔

## والد صاحب کی علالت

ہم اچھے ہوئے ہی تھے کہ والد صاحب کے سرطان کا پھوڑا نکل آیا۔ عرصہ سے پیشاب میں شکر آتی تھی۔ مگر پرہیز بھی نہ کیا۔ ڈاکٹر کہا کرتے تھے کہ آپ زمین کے

نیچے کی ترکاریاں کھائیں تو جواب ہمیشہ ہی دیتے تھے کہ کیا تار کا شور بہ کھایا  
 کروں یا آسمان کے ستاروں کی بھیجا شکر اور مٹھائی تک کھانا چھوڑی شکر پر  
 پابندی عائد ہوئی تو فرمایا کہ بہتر ہے میں گڑ کھایا کروں گا۔ مختصر یہ کہ کبھی کسی پرہیز  
 کے لئے تیار نہ ہوئے نتیجہ یہ نکمہ کار بن کر نکلا اور اس کا نہایت خونخوار آپریشن  
 ڈاکٹر حافظ حفیظ اللہ صاحب نے کیا۔ تقریباً آدھ سپر گوشت کاٹ کر پھینک  
 دیا زخم کا قطر ایک بڑے گھڑے کے دہانے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مگر اتنا بڑا آپریشن  
 کرانے کے بعد بھی ان کے چہرے پر کمزوری کی کوئی علامت پائی نہ جاتی تھی۔ بلکہ  
 ہاسپٹل کے پرائیویٹ وارڈ میں رکھے گئے۔ اور ان کی تیمارداری میں ماموں صاحب  
 اور ہم شپ دروز مصروف رہے۔ اسی عیال کے زمانہ میں ایک روز جبکہ ہم ان کا پس پاشا  
 صاف کر رہے تھے اور پافانہ کا برتن صاف کر کے رکھ چکے تھے۔ ہمارے سر پر ہاتھ پھیر  
 کر فرمایا کہ اسی دن کے لئے لوگ اولاد کی تمنا کرتے ہیں۔ کم سے کم میرے لڑکے  
 نے حق ادا کر دیا۔ ماموں صاحب نے جو کچھ کسی بچے کی تعریف کرنا گناہِ عظیم سمجھا  
 کرتے تھے۔ آج پہلی مرتبہ فرمایا کہ اس لڑکے نے ایسی خدمت کی ہے کہ ہمیشہ سے  
 دل میں گھر کر لیا ہے۔ اور یہ انشاء اللہ بڑی ترقی کرے گا۔ اس وقت والد صاحب  
 ہماری طرف کچھ ایسی پیار کی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ ہم ضبط نہ کر سکے  
 اور رو دیئے۔ والد صاحب نے پیار سے کہا: بیوقوف ہوا ہے۔ اسے اب میں چھو  
 ہوں۔ مگر دراصل وہ اچھے تھے نہیں۔ اتنا بڑا زخم اگر معمولی حالات کے ماتحت  
 برابر مندمل ہوتا رہتا تو بھی کم سے کم ایک مہینہ سے پہلے وہ بستر نہیں چھوڑ سکتے  
 تھے۔ اور اسی قدر وقت کمزوری اور بیماری کے اثرات دور ہونے کے لئے درکار



مگر یہاں تو حال یہ تھا کہ آج زخم میں یہ خرابی ہو گئی۔ کل یہ نقص پیدا ہو گیا ایک  
مرتبہ زخم میں نہ ہر لیے چھالے پڑ گئے اور ڈاکٹر صاحب بھی سخت بدحواس ہو گئے کہ  
اب ان کا جانبر ہونا مشکل ہے۔ مگر خدا نے فضل کیا۔ اور دوسرے ہی  
دن حالت سنبھل گئی۔ ہم مسلسل والد صاحب کے ساتھ رہے۔ اور ان کو  
کبھی کسی ملازم کی کسی خدمت کار کی یہاں تک کہ مہتر تک کی ضرورت محسوس  
نہ ہونے دی۔ حالانکہ ملازم برابر موجود رہتا مگر مجھے اس پر اعتبار نہ تھا۔ اس لئے  
کہ اس کے دل کو نہ لگی تھی۔ وہ تو محض تنخواہ پانے کے لئے یہ خدمت کر رہا تھا ہم کو  
خود والد صاحب کا ہر کام کر کے ایک اطمینان سا محسوس ہوتا تھا خدا خدا  
کر کے دو مہینہ کے بعد زخم قریب قریب مندمل ہو گیا۔ اور ڈاکٹر سے لڑھکھڑاکر  
آپ اس وعدے پر گھر آ گئے کہ باقاعدہ احتیاط کے ساتھ گھر ہی پر ڈریسنگ  
کرائیں گے۔ مگر گھر پر آ کر علاج میں اپنی رائے سے رد و بدل کرنے لگے اور اس  
کا نتیجہ یہ ہوا کہ زخم مکمل طور پر بہت دنوں میں ٹھیک ہوا۔

## سلامت مزاحیہ مضمون

تعلیم تو اب گویا ختم ہو ہی چکی تھی کبھی کبھی ارادہ ہوتا تھا کہ پرائیویٹ  
ٹوپر کسی امتحان میں بیٹھ جائیں مگر رفتہ رفتہ یہ ارادے بھی ختم ہو گئے اور اب  
ہم بالکل ہوم ممبر تھے۔ خالص انشا پر داڑ اس زمانہ میں "رسالہ ترچھی نظر"  
جو این سلونوی صاحب کی ادارت میں رسالہ نظر بن چکا تھا اور اس کا ترچھا  
پینر کا لڑھا چکا تھا۔ ہمارے افسانوں سے کسی ماہ خالی نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ معلوم

نہیں کیا سوچیں کہ ایک مزاحیہ مضمون بیٹھے چادر کے نام سے لکھ دیا یہاں عرض کر دینا  
غیر ضروری نہ ہوگا اس مضمون سے پہلے ہم نے کوئی مضمون دیکھا یا سنا بھی نہیں تھا۔  
تفریحی لٹریچر اور فکاہی مضامین ہماری نظر سے اب تک نہیں گزرے تھے۔ اور ہم نے  
اپنے نزدیک گویا بڑا تیر مارا تھا۔ یہ مضمون عام طور پر بہت پسند کیا گیا حالانکہ تھا بڑا  
عوام پسند قسم کا سٹچی مضمون جس کو دیکھ کر اب بہت شرم آتی ہے لوگوں نے مشورہ  
دیا کہ تم اسی طرز کے لئے اپنے قلم کو مخصوص کر لو۔ مگر ہم نے اس مزاحیہ  
مضمون کے بعد پھر بہت دنوں تک کوئی مزاحیہ چیز نہیں لکھی البتہ سنجیدہ  
مضامین اور انہماک سے لکھتے رہے۔

## رسالہ حسن ادب

اب تک ہم صرف رسالہ ترجمہ نظر اور اس کے اسی کی اصلاحی شکل رسالہ  
نظر سے واقف تھے۔ مگر ایک دن پاٹا نالہ کے بازار سے گزرتے تھے کہ ایک  
دھندلا سا سائن بورڈ نظر آیا جس پر لکھا تھا "رسالہ حسن ادب لکھو" اور سامنے  
ہی ایک صاحب بیٹھے تھے۔ کرنا اتارے۔ پاجامہ پہنے۔ سر منڈا ہوا۔ اور  
کانوں میں اکھڑے کی لگی ہوئی مٹی۔ صورت دیکھ کر پتہ چل گیا کہ آدمی  
ہیں پہلوان قسم کے اور اس وقت غالباً اس رسالہ کے ایڈیٹر صاحب کو دور کرنے  
یا کسی مضمون پر خفا ہو کر ان کو چیت کرنے تشریف لائے ہیں۔ ان سے دریافت  
کیا کہ کیا یہاں سے کوئی رسالہ نکلتا ہے۔ آپ نے فوراً چٹائی پر دو ہاتھ مار کر  
گردا گردی۔ اور ارشاد فرمایا تشریف رکھئے۔ ہم نے بیٹھ کر پھر وہی سوال کیا جواب

ملا جی ہاں نکلتا ہے۔ مگر اس مرتبہ اس کے دو نمبر ساتھ ساتھ نکل رہے ہیں۔ تازہ پرچہ پچھلے مہینہ سے اب تک نہیں نکلا ہے۔ اس لئے پچھلے پرچے کو اور اس پرچہ کو ایک ساتھ لا کر نکالا جا رہا ہے۔ ہم نے دریافت کیا کہ کون صاحب نکالتے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کون ہیں۔ باقاعدہ دفتر کہاں ہے۔ ان تمام سوالوں کے جواب میں معلوم ہوا کہ یہ حضرت خود ہی سب کچھ ہیں۔ ع۔  
خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ

اپ خود ہی اس رسالہ کے مالک تھے۔ خود ہی مدیر تھے۔ خود ہی کاتب تھے۔ خود ہی مصلح سنگ تھے۔ خود ہی پریس مین تھے۔ بلکہ صورت سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ خود ہی پریس بھی ہوں گے۔ مگر سامنے ہی ایک دستی پریس ان حضرات کا کرتا پہنے کھڑا تھا اس وقت یہ حضرت اسی رسالہ کی کلپنی میٹھے لکھ رہے تھے آپ نے بتایا کہ میں سب کام خود ہی کرتا ہوں اور یہ رسالہ اپنے تمام مدارج میسر ہی ہاتھوں میں کرتا ہے۔ آپ نے رسالہ کا ایک گزشتہ پرچہ دکھایا جس پر ادارت میں سید محمود الحسن نقوی کا نام لکھا ہوا تھا۔ ان کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اب اس کی ادارت نہیں کر سکتے۔ اس لئے کچھ زیادہ اچھے آدمی ثابت نہیں ہوئے۔ اور آپ نے یہ بھی بتایا کہ آپ ایک معقول قسم کے آدمی کی تلاش میں ہیں جس کا نام ادارت میں دیا جاسکے۔ اور جو رسالہ سے کچھ دھپی بھی لے سکے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں ایڈیٹر کو کسی قسم کا معاوضہ تو خیر نہیں دیتا۔ مگر ایڈیٹری یہ تو آپ جانتے ہوں گے۔ کہ کتنی عزت کی چیز ہے اسے لکھنے والی اس کو یوں سمجھئے کہ یہ گویا بڑی عزت کی چیز ہے کیا نام کہ ایڈیٹر ہونا ہر ایک کو میسر ہی کب آتا

ہے ہم نے کہا۔ آپ نے کہا بجا ارشاد فرماتے ہیں۔ بہر صورت آپ کا یہ تازہ پرچہ  
تو چھپ ہی رہا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی اور نمبر اس کا نکل سکا۔ تو میں بھی اس  
کے لئے مضمون دوں گا۔ آپ نے فرمایا "مضمون اگر آپ دے دیں تو کیا  
نام کہ اسی رسالہ میں یعنی اسی نمبر میں نکل سکتا ہے ابھی کافی جگہ ہے صرف  
ایک ہی مضمون میرے پاس ہے اور ایک غزل ہے اور نکالنا ہے دوسرا  
پرچہ کیا نام کہ دو مہینوں کا گویا مشترکہ پرچہ " ہم نے ان سے اسی طرح دیر تک  
گفتگو کرنے کے بعد یہ وعدہ کر لیا کہ ایک سے زیادہ مضمون ان کو دے دیں گے  
اور اس وعدے کو دوسرے ہی دن وفا بھی کر دیا۔ یعنی ایک افسانہ اور ایک  
مضمون جو غالباً ربات یا کالی رات یا صبح بنا رس یا شام اور دو کے متعلق  
کچھ کچھ اس تھی دے دیا ان مضامین کو دیکھ کر ان حضرات نے کچھ غور کرنا شروع  
کر دیا۔ ہم سمجھے کہ ان مضامین کو اپنے معیار پر جانچ رہے ہیں۔ مگر قصہ کچھ اور ہی تھا  
چنانچہ ایک دن چونک کر فرمایا۔ اور اگر میں آپ کا نام ایڈیٹر میں دے دوں ہم کو اس  
کی امید بھی نہ تھی کہ ہمارے حصہ میں یہ اعزاز آنے والا ہے۔ ہم نے کچھ دیر تامل کیا غور  
کرتے رہے کہ یہ اعزاز قبول کرنا چاہتے یا نہیں۔ آخر ہم نے ایک فیصلہ کن انداز  
کے ساتھ کہا۔ بات یہ ہے۔ احمد علی صاحب! یہ ان بزرگ کا نام نامی  
تھا کہ مجھے اس میں کوئی حذر تو نہیں ہے مگر میں رسالہ کی موجودہ شکل بدلنے  
کا مطالبہ کر دوں گا۔ اس میں فی الحال بہت ہی کچھ قسیم کے مضامین نکل رہے ہیں  
و احمد علی صاحب نے جلیبی کھاتے ہوئے فرمایا۔ "وہ تو سب ٹھیک ہے کیا نام کہ آپ  
اس کو بہتر بنائیں گے۔ اس میں سیرا کیا نقصان ہے ارے بھئی یہ تو کیا نام

کہ اپنے ہاتھ کی بات ہے ذرا ہاتھ سینچاں کر رکھ دیا کیجئے۔ کتابت میں مرگ ہی کچھ  
 اور پیدا ہو جائے گی۔ ذرا احتیاط سے پھر بنا دیا۔ آئینہ ہو گیا: مختصر یہ کہ  
 ہم نے قلم داری کو قبول کر لیا۔ اور رسالہ کا دوسرا ہی روپ ہو گیا۔ اب جو  
 تازہ نمبر نکلتا ہے تو سرورق پر لکھا تھا۔ ایڈیٹر ملک التحریر شیخ مہدی عمر شہوت  
 تھا نوی ایہ ملک التحریر اس لئے تھا کہ کسی رسالہ کے سرورق پر ایڈیٹر کے بجائے  
 "رکیں التحریر" ہماری نظر سے گزر چکا تھا۔ لہذا ہم نے اپنے لئے ملک التحریر سے  
 کم کوئی درجہ مناسب نہ سمجھا۔ منشی واحد علی صاحب اب بھی موجود ہیں اور  
 اخبار سرچ کی کتابت فرماتے ہیں ان کا پرچہ اور پریس سب غالباً جلیبی  
 والے کے نذر ہو گیا۔

## خصتی

۱۹۲۶ء کے ادائل ہی سے ہماری طرف سے یہ کوشش شروع ہو چکی  
 تھی کہ کسی طرح خصتی کی رسم پوری کر دی جائے۔ اور ہماری سعیدہ ہمارے پاس  
 آجائیں مگر ہمارے خسر صاحب کے حالات اجازت نہ دیتے تھے کہ یہ تقریب  
 عمل میں آئے۔ والدہ صاحبہ سے خط لکھوائے۔ والد صاحب نے اصرار کیا  
 اور حبیب سب کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ تو ماسے عقلمندی کے ہم نے نہ معلوم ان کو خط  
 میں لکھ دیا جس کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا تھا کہ اگر آپ کو خصتی سے انکار  
 ہے تو اب مجھ کو بھی اس رشتہ سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ ٹھہرے عالم دین اس  
 خط پر ان کو یہ شبہ ہو گیا کہ کہیں صاحبزادہ جلد اقبال نے اپنا پہلا ہی رنگ دکھایا

اب ان سے دریافت کر کے لکھا جائے کہ ان کا دراصل مدعا کیا ہے تاکہ ان کے الفاظ واضح صورت میں میرے سامنے آئیں۔ تو میں فیصلہ کروں کہ کہیں اس سے خدا نخواستہ طلاق کا مفہوم تو پورا نہیں ہوتا ہے۔ والد صاحب نے یہ خط دیکھا اور ہم کو گھر سے نکل جانے کا نوٹس دے دیا۔ لیکن چلے گئے گھر بسانے وہاں گھر آ کر چڑھنے کے سامان ہو گئے۔ آخر ہم نے پھر نہایت تہذیب قسم کا معذرت نامہ لکھا۔ اپنے پچھلے خط کے الفاظ اس غلطی سے واپس مانگے کہ خسر صاحب یہ خط پا کر باغ باغ ہو گئے۔ اور گھر میں جا کر عورتوں سے کہا کہ صاحب یہ شخص قلم کا بادشاہ ہے۔ ایک ہی خط میں میرے اس رنج اور غصہ کو کا فور کر دیا جس کے متعلق میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میرا دل کیونکر صاف ہو گا۔ گویا پہلے خط سے ہم قلم کے غلام ثابت ہوئے تھے۔ اور دوسرے خط نے اسی قائد ان غلاموں کو سر پر آراء سلطنت کر دیا۔ مگر اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ خجندی کی تاریخ طے ہو گئی اور دسمبر ۱۹۸۲ء ہم پھر ایک مرتبہ دو لہا بن کر گھنٹوں سے مین پوری گئے۔ والد صاحب قبلہ پہلے ہی سے مین پوری کی نمائش میں خان بہادر سید زین الدین کلکٹر مین پوری کی دعوت پر تشریف لے جا چکے تھے۔ آپ نے تاریخ طالع دی کہ تم لوگ آگے میں ہیں بارات میں شامل ہو جاؤں گا۔ لہذا ماموں صاحب ہم کو اور ہمارے ایک دوست کو لے کر مین پوری روانہ ہو گئے یہ گویا تین آدمیوں کی بارات تھی۔ اور جو تھے باراتی مین پوری ہی میں موجود تھے۔ نہایت سادگی کے ساتھ خجندی محل میں آئی۔ کسی قسم کی کوئی رسم ادا نہیں کی گئی۔ محض یہ کہ سلام کرائی ہوئی اور جو تھوڑا بہت روپیہ اس سلسلہ میں ملا۔ وہ ماموں صاحب کے حوالے کر کے ہم اپنی

سیدہ کو لکھنؤ لے آئے یہاں البتہ جہان بھی کافی تھے۔ اور گھر میں شادی کی  
چہل پہل بھی نظر آ رہی تھی۔

## دوسرے

ہر چند کہ شادی کے سلسلہ کی تمام رسموں کے لئے والد صاحب نے بھی منع  
کر دیا تھا۔ اور ہم بھی ان رسموں سے بالکل متفق نہ تھے بلکہ رسموں کے بائیکاٹ  
کا اعلان کر چکے تھے۔ مگر پھر بھی دوسریں ہو کر رہیں پہلی رسم یہ کہ دلہن کے دامن  
پر کھڑے ہو کر تازی بڑھو۔ گویا تازی بڑھوائی جائے تو وہ بھی دلہن کو جار نماز بنا کر  
عبادت کی بلے۔ مگر شرک کی آغوش میں۔ مگر اب ان بڑھیوں سے کس کا بس  
چل سکتا تھا۔ کھڑے ہو کر نیت باندھی کہ نیت کرتا ہوں میں دو رکعت نماز کو  
جس کی ذمہ داری اس گھر کی بڑی بوڑھیوں کے سر ہے۔ وقت جو نماز  
کے ہر وقت سے الگ ہے۔ منہ میرا طرف بیوی کے اللہ معاف کرے۔ اور اس  
کے بعد نہ جانے کیا زیر لب بد بولتے رہے اور اسی طرح یہ نماز ختم ہو گئی  
دوسری رسم کھیر چٹائی کی تھی۔ کہ دلہن کو کھیر چٹاؤ اور اس کے ہاتھ سے کھیر  
چٹاؤ۔ اس رسم سے کبھی کسی نہ کسی طرح جان چھوٹی۔ وہ تو کہے کہ ان دنوں رسموں  
کے بعد دولہا میاں بھاگے سر پر پر رکھ کر۔ ورنہ بیوڑتیں تو اس وقت تک دم  
ہی نہیں لیتیں جب تک کہ دولہا کی سات پشتوں کو احق بنا کر نہ رکھ دیں ان  
کے نزدیک تو سب سے زیادہ کامیاب دولہا وہی ہوتا ہے جو سب سے زیادہ  
چغڑنایت ہو۔ معلوم یہ ہوا کہ وہاں اُرسی مصحف کے انتظامات بھی تھے مگر



خدا نے ہم کو بال بال پڑا دیا۔

## دلہن کی نماز

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہماری خالہ اماں بیگم صاحبہ بہادر شیخ احمد علی فاضل  
نے ہم کو بلا کر مبارکباد دی کہ: بیٹیا میں تو مبارکباد اس بات کی دیتی ہوں کہ  
دلہن اللہ رکھے ہے پکی نمازن اس نے اپنے دلہنایے کی پرواہ بھی نہیں کی  
اور چادر تنو اگر اسی دلہنایے تمام وقتوں کی نماز پابندی سے پڑھ چکی  
ہے۔ ہم ان کے سنا منے تو مسکرا کر رہ گئے۔ مگر دل میں ایک تشویش  
یہ پیدا ہو گئی کہ

نبھے گا کس طرح سے اس پر می پیکر سے یارانہ

کہ وہ اتنی نمازن اور یہ گھر پورا بت خانہ

چنانچہ یہ تشویش بعد میں صحیح بھی ثابت ہوئی اس لئے کہ شادی کے بعد سے  
اب تک اس سلسلہ میں ایک کشمکش جاری ہے۔ نہ وہ ہم کو نماز پڑھوا سکیں  
نہ ہم ان کی نماز چھڑا سکے۔ وہ تو خیر بلا وجہ نماز نہیں چھوڑ رہی ہیں مگر ہمارے پاس  
نماز نہ پڑھنے کا ایک بہت بڑا عذر موجود ہے کہ اب اگر ہم نے نماز پڑھی تو خدا  
ہم سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ اے بندے تو نے ہمارے کہنے سے تو نماز پڑھی  
نہیں۔ اب بیوی کے کہنے سے کیوں پڑھ رہا ہے اور اس حالت میں یہ نماز  
ہمارے لئے سہولت یا تو اپنی بیوی کے لئے پڑھتا ہے! ان حالات کے  
ماتحت انتظار ہے۔ اس وقت کا جیب خدا بیوی کو یہ توفیق دے کہ وہ نماز

کے لئے کہنا چھوڑ دیں۔ اور ہم کو یہ توفیق عطا کرے کہ ہم جس کی نماز پر اسی کیلئے پڑھیں

## سعیدہ ملاقات

دن بھر کے انتظار کے بعد رات آئی اور وہ بھی آدھی گزر گئی تو اندر سے طلبی ہوئی اور ہم دھڑکتے ہوئے دل اور سنسناتے ہوئے ہاتھ پیر کے ساتھ ڈگر گاتے ہوئے اندر پہنچے۔ سب سے پہلے والدہ صاحبہ نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ کیا خوبصورت دعا دی ہے۔ کہ جاؤ میاں خدا کرے اس کی ایڑی دیکھ کر کسی اور کی صورت نہ دیکھو، شاعر کا اس شعر سے خواہ کچھ بھی مطلب ہو مگر ہم کو چشمی کے لئے قطعاً تیار نہ تھے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ ماں کی بددعا بھی دعا ہو کر نکلتی ہے چنانچہ ان کی ایڑی دیکھ کر آج بھی اچھی صورت پر برسی نظر پڑ رہی جاتی ہے والدہ صاحبہ نے ایک اور عزیزہ کو اشارہ کیا اور وہ ہم کو حجلہ سر و سی میں لے جا کر چھوڑ آئیں۔ جہاں ہماری سعیدہ ایک لال رنگ کی گھٹری بنی بیٹھی تھیں اور ہماری زگاہوں میں ان کا وہی تمکنت مآب چہرہ گھوم رہا تھا۔ جب وہ مین پوری میں ہم سے کہہ رہی تھیں کہ اپنی شادی میں ہم لوگوں کو بھلا کیوں بلانے لگے۔ ان بیپاری کو کیا معلوم تھا کہ یہ شخص اپنی شادی میں صرف ان ہی کو بلائے گا۔ تنہائی ہونے ہی ہم نے سعیدہ سے کہا کہ سنئے جناب اب اپنی گردن سیدھی کیجئے اور چوخیلے چھوڑ کر آدمیت کے جامہ میں آجائیے۔ مگر وہ بھلا کب سننے والی تھیں آخر ہم نے خود ان کی گردن سیدھی کر دی۔ اور ایک لکچر دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ یہ شرم و جہا ایک حد کے بعد جہالت کی نشان بن جاتی ہے۔ آپ ماشاء اللہ

پڑھی کھی سمجھدار ہیں۔ اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہم دونوں کی باہمی زندگی کا یہ  
 پہلا دن یا پہلی رات ہے اگر اس زندگی کی ابتدا ان چو نچلوں اور اس جہالت  
 سے ہوئی تو اللہ حافظ ہے۔ لہذا میرا مشورہ یہ ہے کہ میں سب سے پہلے آپ سے  
 مصافحہ کروں۔ شرعی طور پر دو سال قبل آپ اپنے کو میرے حوالے کر چکی ہیں اور  
 آج اپنا ہاتھ بڑھا کر اس قول کی تصدیق کر دیئے ہمارا بیکچر ختم ہو گیا۔ مگر وہاں سے  
 کوئی رسید نہ آئی۔ اور ہم دیر تک ہاتھ بڑھائے کھڑے رہے۔ آخر ہم نے ادنیٰ  
 متاثر کرنے والے الفاظ ڈھونڈ کر تقریر کی کہ دیکھئے یہی وقت ہے جو ہم دونوں کی  
 زندگی بنانے یا بگاڑنے کا فیصلہ کرے گا۔ اس امتحان کے وقت آپ کا اس طرح  
 خاموش رہنا کوئی خوشگوار نتائج مشکل سے پیدا کرے گا۔ ضرورت اس کی  
 ہے کہ اپنا مستقبل کچھ خوشگوار بنیادوں پر ہم دونوں تعمیر کریں۔ مجھے یہ معلوم ہے  
 کہ آپ خدا کا خواست نہ ہری نہیں ہیں۔ میرے الفاظ سن رہی ہوں گی۔ گونگی بھی نہیں  
 میری بات کا جواب دے سکتی ہیں۔ لہذا اب آپ منہ سے بولنے سے کھیلنے اور  
 سب سے پہلے اپنا یہ پہل گھونگھٹ الٹ دیجئے جس سے مجھے اصلاح ہو رہا ہے  
 پھر جواب نہ دار و اور حالات حسب معمول مجبوراً ہم نے خود گھونگھٹ الٹ  
 دیا۔ اور ان سے استدعا کی کہ خدا کے واسطے اپنی ناک سے یہ تھ اتار دیجئے جسے دیکھ  
 کر یا تو میں بھاگ جاؤں گا۔ ورنہ یہیں گر پڑوں گا۔ اور اگر اس سلسلہ میں بھی  
 آپ نے میری شنوائی نہ کی۔ تو میں آپ کو مزید زحمت دینے بغیر یہاں سے وفغان  
 ہو۔ جاؤں گا شکر ہے کہ اس سلسلہ میں ہماری درخواست فوراً منظور ہو گئی اور  
 تھوعلبدی سے اتار دی گئی۔ اب گویا حالات اُمید افزا تھے۔ لہذا ہم نے موقع غنیمت

جان کر کہا، شاہباش، دل خوش ہو گیا۔ اب البتہ انسانوں کی سی صورت معلوم ہوتی ہے پہلے تو تھپہن کر آپ دنیا کا نقشہ نظر آ رہی تھیں۔ اچھا اب مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائیے۔ بڑھائیے جلدی ہاتھ ایک دو تین۔ چار میں دس تک گنتا ہوں اس عرصہ میں آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ ایک دو تین چار پانچ چھ سات، آٹھ، نو اور اور اور اچھا توحید حافظ ہم اکٹھے ہی والے تھے کہ وہاں ایک جنبش ہوئی۔ اور ہم نے پھر کہا: جی ہاں۔ آٹھ۔ نو۔ اور ایک خفیف سی جنبش کے بعد ہاتھ میں ہاتھ لے کر کہا: واقعی سعیدہ تم میری توجہ کے بالکل خلاف ثابت ہو رہی ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ تم عام دلہنوں سے مختلف ایک سمجھدار دلہن ثابت ہو گئی۔ اور ان دتیا نوبی ڈھکوسلوں کی ہرگز قابل نہ ہو گی آخر یہ کیا واہیات ہے اچھا بتاؤ تم میری کون سی بے بو۔ بو۔ اور دیکھو منہ اٹھاؤ اور دیکھ کر بتاؤ تم میری کون سی بے بو۔ منہ تو خیر نہیں اٹھایا۔ مگر ایک نہایت باریک مگر کھنکھتی ہوئی آواز میں جواب ملا: کینز ہم ایک دم اچھل پڑے کہ ارے واہ ری میری بیوی کوئی اور عورت ہوتی تو لونڈی کہتی۔ اس موقع پر گو کینز یہ علامت ہے پرٹھی لکھی ہونے کی۔ لونڈی کا لفظ سن کر جو کھیل داغ میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک میلی کھیلی کمال کلوی ہوئی کسی ناک اور نیلے ہونٹوں والی لونڈی یا سامنے کھڑی اپنے جھونٹے نوچنے کے انداز سے کھجاری ہے اس کی پسند بھی پسند بھی آنکھوں میں کچھ بھی بھری ہے۔ مگر کینز سن کر ایک دوسری تصویر سامنے آتی ہے کہ گویا مصر کے کسی بازار میں کھڑے ہیں۔ اور وہاں ایک دھان پان نازک سے نقشہ والی گوری جیٹی سادہ لباس پہنے معصوم سی کینز مہارے سامنے .....

موجود ہے جو ہمارے احکامات کی منتظر ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ ہم کو خود  
کوئی حکم دے۔ اور ہم اس کی تعمیل کریں بہر صورت اس وقت سعیدہ کی زبان  
سے کنیز سن کر ہم نے ان کو اپنی آغوش میں گھینچ لیا۔ اور اب تک قہنی انسانیت  
اور شرافت برقی تھی۔ ان سب کی تلمانی کر دی نتیجہ یہ کہ ابھی اندھیرا ہی تھا اور  
کچھ خفیف سی بارش بھی ہو رہی تھی کہ سعیدہ نے ہم کو کمرہ سے باہر نکل جانے کا حکم دیا  
اور باہر نکل کر ہم نے دیکھا تو دانتی ابھی کافی دیر تھی۔ دن نکلنے میں چوروں کی طرح  
زمانہ حصے نکل کر مردانہ نشست میں آئے اور اپنے ایک عزیز کے بستر میں گھسے ہی  
تھے کہ وہ حضرت تانہ جانے کیا سمجھ کر چیخ اٹھے اور سونے والوں میں سے کم سے کم آدھے  
لوگوں کو تو ان حضرات نے جگا کر یہ خبر کر دی کہ ہم باہر آگئے ہیں۔  
اسی دن دعوت ولیمہ تھی۔ مگر شکر ہے۔ چوتھی۔ چالے۔ وغیرہ سے  
ہم کو واسطہ نہ پڑا۔

## شوہر نہ تھا ٹھٹھا

اب ہم خود اپنی نظر میں کچھ ذبیح کچھ بھاری بھر کم اور کچھ ذمہ دار سے معلوم ہونے لگے  
تھے۔ حالانکہ غیر ذمہ دار یوں کا عالم یہ تھا کہ بیوی گھر میں رہ چکی تھی۔ اور ہم نفس نہیں تھے۔ نہ  
کمانے کی فکر نہ کچھ تدبیر مستقبل تعلیم چھوٹ ہی چکی تھی۔ گھر کی خبر بھی ہم کو تھی کہ مسکون  
نہیں خرچ کیونکر چلتا ہے۔ اور اچھی خاصی شاندار زندگی بسر ہوتی ہے۔ جو دیکھتا ہے  
وہ یہ سمجھتا ہے کہ کھاتا پیتا گھرانہ ہے۔ مگر گھر میں بس اللہ کا نام ہی تھا والہ اللہ  
کی معمولی پیشین گوئی علاوہ اور کوئی خاص آمدنی نہ تھی جو روپیہ جمع تھا۔ وہ خرچ ہو چکا

تھا مگر ان میں سے کوئی بات بھی ہمارے ذہن میں نہ آ سکی۔ ہم تو اپنے شوہر انہ ٹھاکہ  
 میں تھے۔ کہ ایک علیحدہ سجا ہوا کمرہ ہم کو مل گیا تھا جس میں معطر معطر ایک دہن  
 شام کو بھولوں سے لدی اور دن کو بیسکے بال پشت پر کھولے ہوئے ہم کو ملنا  
 کرتی تھی۔ ہم سو جاتے تھے تو وہ بیچاری پنکھا جھلا کرتی تھی۔ ہم کو خوش کرنے  
 کے لئے وہ ہماری ہل سے ہل بات پر بھی بیٹھتی تھی گویا ہم واقعی بہت بذلہ سنج  
 اور بڑی خوشگوار گفتگو کرنے والے تھے۔ ہم اس کو اپنے ہل شر سنا یا کرتے تھے اور  
 وہ آنکھوں کو وحید میں لاتی تھی۔ اپنے سچے ہوئے پاندان سے گلیوں پر گلیوں پر لگا کر  
 دیتی تھی۔ یہ باتیں ہر بیوی کرتی ہوگی۔ مگر ہمارے لئے یہ باتیں بہت ہی مفرح  
 ثابت ہو رہی تھیں۔ اکثر ہم اپنے اس اقتدار کا سکہ احباب پر بٹھانے  
 کے لئے یہ بھی کرتے تھے کہ گھر میں بیوی سے کہہ گئے کہ میں رسالہ نظر کے دفتر  
 جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں وہاں سے چاء منگاؤں گا تم ذرا اہتمام کے ساتھ بیچ  
 دینا رسالہ نظر کے دفتر میں پہنچے۔ امین سلو نوئی صاحب سے ادھر ادھر کی باتیں  
 کرتے رہے بیوی کی قابلیت کے قصیدے پڑھے اور آخر چلنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا کہ  
 بھئی اب میری چار کا وقت آگیا ہے تم کو چلنا ہو تو چلو میرے ساتھ یا اگر کوئی آدمی  
 گھر تک بھیج سکو تو یہیں چلے منگالوں۔ امین صاحب نے فوراً ایسا آدمی بھیج دیا اور  
 گھر سے نہایت بڑکھٹ چائے بغیر انتظار کے آگئی۔ اب امین صاحب کہ بھئی یہ  
 یہ تو پوری ٹی پارٹی کا سامان ہے۔ اور ہم گویا بے پردائی سے کہہ رہے ہیں یہی تو  
 ہیں کہتا ہوں کہ بیوی ہو تو کم سے کم ایسی تو ہو بھئی میں تم سے کیا کہوں حال یہ ہے  
 کہ صبح میں غسل کرنے کے لئے جاتا ہوں تو فوراً سوال ہوتا ہے کہ آج آپ

کون سا سوپ استعمال کریں گے۔ موسم تو پیرس کا ہے۔ یا پھر سیڈیکور استعمال کیجئے  
 غسل خانہ میں پہنچے تو نہاں ہر چیز سلیقہ سے موجود کپڑے الگ ٹنگے ہیں۔ تولیہ  
 الگ اسٹینڈ پر موجود پانی کا ٹمپر پیر وہ خود دیکھتی ہیں۔ میں کہتا بھی ہوں کہ آخر اس  
 کی کیا ضرورت ہے۔ تھوڑا سا گرم یا تھوڑا سا ٹھنڈا ہو جائے گا تو کیا مضائقہ ہے  
 مگر وہ ان باتوں کو بڑی اہمیت دیتی ہیں۔ اب دیکھو یہ معمولی سی بات ہے کہ یہ جو۔  
 ٹی کوڑی ہے۔ یہ خود ان ہی کی بنائی ہوئی ہے، این مریوب ہو کر کہتے » اچھا اے  
 بھئی یہ تو بڑی لاجواب ہے۔ ایسی تو بھائی سے ایک مجھے بھی بنوادو » چنانچہ دوسرے  
 ہی دن ہم ایک ٹی کوڑی حضرت گنج سے جا کر اسی نمونے کی لے آتے اور ان کو دے  
 دیتے کہ » یہ لیجئے میں نے جو جا کر سرکار سے عرض کیا کہ این کو تمہاری بنائی  
 ہوئی ٹی کوڑی بہت پسند آئی ہے۔ تو پہلے تو ایک ادائے خاص کے ساتھ  
 جھک کر سلام کیا۔ کہ میں کس قابل ہوں۔ یہ سب فیضِ محبت ہے پھر چپ میں  
 نے کہا کہ این نے بھی ایسی ہی ٹی کوڑی کی فرمائش کی ہے۔ تو ٹھنک کر کہنے لگیں  
 کہ اللہ اس میں ایسے کون سے فعل جڑے ہوئے ہیں۔ یہ تو یونہی معمولی سی بنا دی  
 تھی۔ میں ابھی ان کے لئے بنائے دیتی ہوں۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں یہ ٹی کوڑی  
 تیار کر کے دے دی۔ اب این کا اعتقاد ظاہر ہے کہ کس قدر نچتہ ہو گیا ہو گا اسی  
 طرح کسی دوست کو بیوی کا کلام سنا ہے ہیں۔ کسی کو بیوی کے افسانے سنا  
 رہے ہیں کسی کو چاکلیٹ کھلا ہے ہیں۔ کہ یہ گھر ہی کا بنا ہوا ہے تمہاری  
 بھائی نے بتایا تھا۔ اور جب وہ میلے چلی گئیں تو ہمارے تمام دوستوں کو  
 یہ خبر تھی کہ آل انڈیا لیڈرز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے گئی ہوئی ہیں



نتیجہ یہ کہ تھوڑے ہی دنوں میں ہمارے تمام دوست اپنی اپنی بیویوں سے نہ صرف  
بد عقیدہ ہو گئے، بلکہ ہم پر رشک بھی کرنے لگے کہ اس کمبخت کو دیکھو کیسی لاجواب  
بیوی پائی ہے۔ جو ہر فن مولا ہے، ممکن ہے یہ بات ہم عرض کرتا بھول جائیں کہ سعید  
اب شوکت دہن کے نام سے رسائل میں بھی چھپنے لگی تھیں۔

## بیوی کی تصویر

ایک دن تو خدی ہو گئی، ہم کو راستہ میں ایک لفافہ پڑا ہوا ملا، کھول کر دیکھا  
تو اس میں ایک تصویر تھی، نہایت خوبصورت اور بالوں کے انداز و لباس کی تزئین  
سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی تعلیم یافتہ لڑکی کی تصویر ہے۔ اس تصویر کو ہم نے اپنے  
پرس میں رکھ لیا، اور اب جو احباب کے سامنے پرس کھولتے ہیں تو تصویر  
سامنے ہی تھی، یہ سب شیطان بیوی کی تصویر، بیوی کی تصویر کہہ کر بیکے ہماری  
طرف، اور ہم نے تصویر کو چھپانے کی بظاہر بہت کوشش کی، آخر ان حضرات نے  
تصویر چھپینا خوب خوب دیکھی، مختلف ریاء کس پاس ہوئے، کسی نے کہا کہ  
یار ایسی بیوی پا کر تو کبھی خود بھی آئینہ دیکھتا ہے، کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ، ایک  
صاحب نے رائے دی کہ میاں تم ایک ماہر نقال ہو بیوی کو لے کر اگر بیٹی چلے جاؤ  
تو کسی فلم کے لئے تم اور وہ دونوں معقول معاوضہ پر رکھ لئے جاؤ گے، مختصر یہ کہ  
وہاں تو شب کو یقین کہ یہ بیوی کی تصویر ہے، اور ہم نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار بلکہ  
اس طرح چپ ہیں کہ گویا اب تو تم لوگوں نے تصویر دیکھ ہی لی، اب میں کیا کر سکتا  
ہوں جب ہم لوگ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو سراج احمد صاحب

جہاں سے ساتھ ہو لئے کہ تم سے ایک کام ہے۔ اور جب دوز نکل آئے۔ تو اِدھر  
اِدھر دیکھ کر کہا۔ یہ تصویر کہاں ملی تھی تم کو؟

ہم نے حیرت سے پوچھا کیوں؟

کہنے لگے۔ ”یوں ہی پوچھتا ہوں۔“

ہم نے بتا دیا۔ ”ایسا کے مکان کے سامنے۔ یہ لفافہ پڑا ہوا تھا میں

نے اٹھا لیا۔“

کہنے لگے کمال ہو گیا۔ میری کتاب سے نہ جانے کس طرح نکل گیا۔ بھابی  
جان کی تصویر ہے اور آپ نے سب سے کہہ دیا کہ میری بیوی کی تصویر ہے سہاں  
لایے تصویر مجھے دیکھئے۔“

ہم نے تصویر دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھ پر آپ الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے  
یہ کب کہا کہ یہ میری بیوی کی تصویر ہے۔ بلکہ میں تو اسی لئے چھپا رہا تھا۔ یہ تو  
ان ہی لوگوں نے کہا کہ یہ میری بیوی کی تصویر ہے اور آپ وہاں کیوں خاموش  
رہے؟“

سراج نے کہا۔ ”ماشاء اللہ تو گویا میں سب سے پہلے دیکھ دیتا کہ بھابی جان کی تصویر ہر تاکہ  
سب میرا مذاق اڑاتے بغیر یہ تو جو کچھ ہوا ہو گیا۔ مگر اب آپ لطیفہ کے طور پر یہ قصہ نہ لے  
بیٹھے گا کہیں؟“

ہم نے وعدہ کر لیا کہ کسی سے نہ کہیں گے چنانچہ اس وقت لکھنے کے علاوہ  
آج تک کسی سے نہیں کہا۔ اور اب لکھنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس لئے  
کہ سراج کی بھابی جان نے اب پردہ بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اور سعیدہ بھی بے پردہ

ہو چکی ہیں۔ اب سب کو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ تصویر کس کی تھی۔ ہماری بیوی  
یا سراج کی بھابی جان کی۔

## مولانا آسی

اسی زمانہ میں امین سلوٹوی صاحب نے ہم کو ایک شعر سنایا۔

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخت پرستوں نے

بہت مجبور ہو کر ہم نے امین وفا بدلا

معلوم نہیں اس شعر میں وہ کونسی بات ہے کہ آج بھی اسے یاد کر کے تقریباً

وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو اس شعر کو پہلی مرتبہ سن کر طاری ہو گئی تھی

بار بار ہم نے اس شعر کو سنا اور بار بار امین صاحب نے غنائیہ یافت کرنے پر

معلوم ہوا کہ یہ شعر مولانا عبدالباری آسی کا ہے جن کے متعلق امین صاحب ہم

کو کئی بار یہ مشورہ دے چکے تھے کہ اگر تم شعر کہتے ہو تو کسی کو دکھا بھی لیا کرو۔ اور

سب سے اچھا یہ ہو کہ مولانا آسی سے مشورہ لے لیا کرو۔ اب تک تو خیر ہم ٹال

جاتے تھے مگر آج یہ شعر سن کر ہم نے امین صاحب سے عرض کیا کہ ہم کو مولانا آسی

کے پاس لے چلو۔ مولانا آسی سے اپنی ملاقات کا ذکر ہم نے شیش محل جلد اول

میں کیا ہے۔ اور یہاں بھی اسی کی کچھ تکرار ہو رہی ہے۔ امین صاحب کے ساتھ

ہم مولانا آسی کے در و درت پر حاضر ہوئے کہوتروں ڈھابلیوں سے بیریز صحن کو

عبور کر کے ہم لوگ ایک دالان میں پہنچے۔ جہاں ایک ادھیر طعمر کے بزرگ

ایک نہایت ضعیف العمر ساتھی کے ساتھ بیٹھے شطرنج میں مشغول تھے۔ امین صاحب

نے جاتے ہی کہا۔ السلام علیکم مولانا۔

مولانا نے فرمایا۔ گھوڑا اچھے یارخ۔ وعلیکم السلام تشریف رکھئے۔  
اور تھوڑی ہی دیر کے بعد مولانا باڑی جیت گئے۔ تو امین صاحب نے تعارف  
کی رسم ادا کی اور ہم نے تعارف کے بعد مولانا سے ان کے اسی شعر کے متعلق عرض  
کیا کہ مجھ پر آج تک کسی شعر کا کبھی اتنا اثر نہیں ہوا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے  
کہ گویا مکمل شعر آج میں نے سنا ہے۔ مولانا اس سلسلے میں مسکرا کر خاموش  
ہوئے۔ اور جب امین سلونوی صاحب نے ہم کو مولانا کی شاگردی میں پیش  
کیا تو مولانا نے ازراہ شفقت ہم کو قبول کر لیا۔

مولانا اُسی کی علمی قابلیت اور شاعرانہ صلاحیت ہم پر روز بروز واضح  
ہوتی گئی۔ اور آج بھی اس سلسلہ میں ہم مطمئن ہیں کہ ہمارا استاد واقعی اپنے  
فن کا ایک مشاق فن کار ہے۔ اور اس کا شاعرانہ مرتبہ یقیناً بہت بلند ہے مولانا  
اُسی کے مشورے سے تھوڑے ہی دنوں میں شعر کہنے، سمجھ کر کہنے اور کہہ کر سنانے  
کے قابل بنا دیا۔ اب تک ہم شعر تو کہا کرتے تھے مگر نہ جانے کہا کرتے تھے یا بکا کرتے تھے  
مگر اب باقاعدہ شعر گوئی شروع کر دی۔ اور مشاعروں میں پڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ دنوں  
تک اپنے استاد کے لب بوتے پر شاعر بنے رہے۔ آخر خود رنگینا پھر چلنا۔ اور اس کے  
بعد دوڑنا شروع کر دیا۔ اب بھی مولانا اُسی اتنی نگرانی ضرور رکھتے ہیں کہ کہیں  
ان کا بڑھایا ہوا ٹوٹھو کر نہ کھالے۔ تفصیلی طور پر مولانا اُسی کا ذکر شیش محل  
میں آچکے ہے۔ اور یہاں چونکہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ لہذا ہی اجمال کافی ہوگا۔

## مشاعرے

مولانا اسی سے مشورہ سخن لینے کا سب سے پہلا نتیجہ تو یہ نکلا اب مشاعروں کی شرکت باقاعدگی کے ساتھ شروع کر دی۔ لکھنؤ میں مشاعروں کی کبھی کمی نہیں ہوتی۔ سوائے محرم کے یہاں مشاعرے بے قید موسم ہمیشہ ہوا ہی کرتے ہیں شاید ہی کوئی منحوس دن ایسا گزرتا ہو۔ جب شہر میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی برقی بنیم سخن گرم نہ ہوتی ہو۔ اور مولانا کا مشورہ یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ مشاعروں میں شرکت کرو۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں ہم نے بے شمار مشاعرے پڑھ ڈالے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مشاعرہ باز حضرات ہمارے پاس شرکت کے دستک لینے ہر طرف سے آنے لگے۔ آواز اچھی تھی پڑھنے کا طریقہ و نشیں تھا۔ لہذا مشاعروں میں خوب خوب اچھے بلکہ دوسرے لوگوں نے بھی بلگرامی صاحب نے تو ہم کو اپنا مستقل گراموفون ہی بنالیا تھا۔ کہ ہم سے ہر مشاعرے میں غزل پڑھواتے تھے اور خود سلام کرتے تھے۔ دراصل ہم نے سب سے پہلے جس مشاعرے میں شرکت کی چودہ انجن معین الادب لکھنؤ کا مشاعرہ بجانب قتل بلگرامی تھا اور طرح تھی

ع۔ پردہ جوائے تاتا ہوں پردہ نظر آتا ہے

وقتل صاحب نے اسی مشاعرے میں اپنی غزلیں پڑھوانے کے لئے گویا اس فاکسار کا انتخاب کر لیا تھا۔ اور آخر میں نواب بخش مرحوم ایک مستقل غزل بن کر رہ گئے تھے۔ اکثر مشاعروں میں یہ بھی ہوا کہ ہم نے اپنی غزل پڑھی۔ دو ایک اور غزلیں پڑھیں اور پھر قتل صاحب کا دو غزل اسے غزل نہ ہو سمجھی کسی غزل میں

پچیس، تیس، شتر سے کم نہیں کہتے تھے۔ اور ہر شعر کے متعلق سامعین سے ان کا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ بار بار پڑھوانے پر اصرار کریں۔ چنانچہ وہ ہمارے پاس بیٹھ کر سلام کرتے جاتے تھے اور چپکے چپکے کہتے جاتے تھے "پھر پڑھو، پھر پڑھو" بات یہ تھی کہ وہ خود غزل میں ڈوبیں یا نہ ڈوبیں مگر ہمارا بیڑہ غرق کر لے کی قسم کھا چکے تھے ایک اودھ مرتبہ خود وصل صاحب کو اپنا کلام خود بھی پڑھنا پڑا اور اس کیفیت کو ہم کبھی الفاظ میں بیان ہی نہ کر سکے۔ جو وصل صاحب کے خود پڑھنے سے پیدا ہوتی تھی کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا تین چار پاگل کتے لڑ رہے ہیں یا منڈی کے کنجڑوں میں کسی بات پر لکڑا رہی ہو گئی ہے۔ یا پاگل خانہ کے کسی کمرے میں کچھ پاگل آپس میں تباہ خیال کر رہے ہیں۔ غزل پڑھتے وقت ان کے گلے کی رگیں پھول جاتی تھیں لکھیں خون بہ ساتی تھیں۔ منہ سے جھاگ اڑتا تھا آواز میں کچھ ہم کچھ ٹینک کی گھر گھڑا، کچھ ریڈیو کی فضائی خرابیاں کچھ رعد کی کیفیتیں سب مل جل کر وہ بات پیدا کر دیتی تھیں جس کو سوائے عذاب الہی کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ سامعین اس غزل کو سن کر تھوڑی دیر تک خدا سے اپنے گناہوں کی توبہ کر لے کے بعد اس قابل ہو سکتے تھے کہ کسی اور کا کلام بھی سنیں اور سمجھیں ڈر کے مارے داد تو سب ہم کو دینا پڑتی تھی۔ مگر وصل صاحب کی غزل سرائی بھی دنیا کی کسی سیراد سے کم نہ تھی غالباً وہ خود اس ادبی درخشش سے تنگ تھے۔ اور واقعی ان کا غزل پڑھنا پوری غزل کی ولادت ہوتی تھی۔ یا تو اس تکلف سے بچنے کے لئے یا اپنی غزل کی خوفناکیت کو کم کرنے کے لئے یعنی سامعین کو ڈرا دھمکا کر داد لینے کے بجائے وہ یہ چاہتے ہوں گے کہ غزل دھپسی سے سنی جائے۔ اور لوگ اس پر خوش ہو کر داد دیں۔ کچھ بھی ہو وصل صاحب

کے اس معمول نے ہم کو مشاعروں سے بیزار کر دیا تھا کہ آخر لوگ کیا سمجھتے ہوں گے کہ وصل صاحب اپنا نوحہ گر سا حق رکھتے ہیں۔ لاکھ لاکھ پینے کی کوششیں کرتے، مشاعروں سے بھاگتے وصل صاحب سے منہ چڑھاتے مگر تو یہ کیسے؟ وصل صاحب کے کاٹے کا منتر ہی نہ تھا۔ وہ غزل پڑھنے کا حکم دے دیتے تھے اور ہم تعمیل کے لئے گویا مجبور تھے۔

## مین پوری کے مشاعرے

ہمارے سرسرم مولوی سجاد حسین صاحب قبلہ نے اپنے داماد کو کثیت شاعر کے اہل مین پوری کے سامنے پیش کرنے کے خیال سے پہلے وہاں کی مقررہ طرحوں پر ہم سے غزلیں منگائیں۔ اس کے بعد ایک شاعرہ میں شرکت کے لئے خود ہم کو طلب کر لیا۔ اسی مشاعرے میں سب سے پہلے حضرت جگر مراد آبادی اور جناب فانی بدایونی سے ملاقات ہوئی جسگر صاحب بہت ہی خصوصیت کے ساتھ ملے۔ اور پھر جب تک ہم مین پوری میں رہے جسگر صاحب کا ساتھ نہ چھوٹا۔ فانی صاحب دوسرے ہی دن آگرہ چلے گئے۔ مگر اسی مختصر ملاقات میں بہت ہی خصوصی تعلقات ان سے بھی قائم ہو گئے۔ مین پوری کے مشاعرے میں دو انمول جواہر اور بھی ملے یعنی بہاری چرن صاحب صادق اور تریبہ سرن شاد۔ ان دونوں سے آج تک براہِ رانہ تعلقات ہیں۔ آج کل یہ حضرات بھوپال میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ اور حال یہ ہے ان دونوں کا کہ بھوپال جا کر ہم اپنے بھائی جان ارشد محمد قانوی صاحب کے یہاں اس لئے ٹھہر نہیں سکتے کہ وہاں بہاری چرن صادق اور تریبہ سرن شاد بھی رہتے ہیں۔ مین پوری کے ان مشاعروں



میں مولوی سجاد حسین صاحب قبلہ خود ہم کو لے جاتے تھے۔ وہ مشاعرے کی صدارت کرتے تھے۔ اور ان کے زیر صدارت جس وقت ہم غزل پڑھتے تھے۔ اس وقت ان کے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے بیتہ چلتا تھا کہ گویا ان ہی کا کلام پڑھا جا رہا ہے۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ یہاں سے کسی شعر پر سنا معین کی دوسن کر سلام کرنے لگیں۔ کہ آداب غرض یہ اسی خاکسار کا خوشی ہے۔

## بہار چھٹ پڑا

ہم ان ہی رنگ ربوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ آج بنارس کا مشاعرہ ہے توکل گو رکھپور کا مشاعرہ آج یہ اردو کا نفرنس ہے توکل وہ مناظر آج یہاں نظم پڑھنا ہے توکل وہاں پیپر سنا ہے کہ یکا یک والد صاحب پھر بیمار پڑ گئے۔ پھر آپریشن ہوا میڈیکل کالج میں و احسن اور وہاں جب کوئی فائدہ نہ ہوا تو گھر پر کیمیشننگم سے آپریشن کرایا۔ مگر مرض کسی طرح قابو میں نہ آسکا۔ ایک شکایت دور دور ہو جاتی تھی اور دو تین شکایتیں پیدا ہو جاتی تھیں اسی زمانہ میں ڈاکٹر محمد عمر صاحب ہمارے خالہ زاد بھائی اور مولوی سجاد حسین صاحب کے برادر عزیز لکھنؤ تشریف لائے ہوئے تھے۔ غالباً پوسٹ گریجویٹ کورس کے لئے۔ آپ نے والد صاحب کا معائنہ کر کے بتا دیا تھا۔ کہ اب ان کا جانبر ہونا مشکل ہے۔ پیشاب میں گر دینا سے جربہ اس قدر نکل چکی ہے کہ اب کوئی امید نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ہر ممکن طریقہ بہتر سے بہتر علاج ہوا۔ دن میں چار چار اور پانچ پانچ ڈاکٹر آئے ایک مرتبہ چھ ڈاکٹروں نے ایک ہی وقت میں دیکھ کر باہمی مشورہ سے علاج کیا مگر وقت

آپ کا تھا۔ ۲۰ مارچ ۱۹۷۹ء کو رائے بہاؤر کنوریم بہاؤر شاہ اور حکیم خواجہ کمال الدین  
 صاحب آپ کو دیکھنے کے لئے آئے تو آپ بہت بٹاش تھے۔ ہنسی مذاق ہوتا رہا  
 اور آخر میں آپ نے رائے صاحب سے کہا کہ ان لوگوں کو کچھ نہ معلوم کیا ہو گیا ہے یہاں چل  
 چلاؤ ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا پروگرام بدلنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں دوستوں نے  
 سمجھا یا مگر آپ ہنستے ہی رہے۔ گویا ان جھولی ٹیلیوں کا مفہوم سمجھتے رہے۔ ان حضرات  
 کے رخصت ہونے کے بعد ہمارے ایک عزیز سے کہا۔ میاں قرآن مجید پڑھ کر سناؤ وہ  
 دیر تک کلام پاک پڑھتے رہے، اور آپ آنکھیں بند کئے سنتے رہے۔ یہ کچھ دیر کے  
 بعد وہ یہ سمجھے کہ سو گئے ہیں۔ لہذا وہ خاموش ہو گئے۔ اور وہاں سے چلے گئے آپ نے  
 آنکھیں کھول کر دیکھا اور ہم سے کہا تم ہی کچھ پڑھ کر سناؤ۔ تو یہ عہد نامہ رکھا  
 اسے پڑھ کر سناؤ میں نے عہد نامہ پڑھ کر سنایا۔ پھر آنکھیں بند کر کے خاموشی سے  
 سنتے رہے۔ اور جب میں خاموش ہو گیا تو پھر کچھ نہ بولے۔ واقعی سو گئے تھے میں بھی  
 بخار میں مبتلا تھا۔ لہذا اسی کمرہ میں ایک طرف لیٹ گیا کہ ریکا ایک دریچے کے  
 قریب وہ ایک دم الجھ کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگے اور اسی وقت سانس حلق میں  
 اٹکنے لگی۔ ماموں صاحب کو دوسرے کمرے سے بلانے دوڑا تو فرمایا، بیٹا سنھل  
 کے اور بس روح پر داز کو گئی۔ گھر میں ایک کمرہ ام چچ گیا۔ والدہ صاحبہ کی حالت  
 دیکھی نہ جاتی تھی۔ خود ہم کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سر کے اوپر سے آسمان اور پیروں  
 کے نیچے سے زمین ہٹ گئی اب ہمارا کوئی سہارا نہ تھا۔ یہ تمام آرائشیں یہ تمام  
 بیفکریاں اور یہ تمام ریاستیں ایک دم ہم سے منہ موڑ گئیں۔

## فکر معاش

عشق بیتاں کا در گیا۔ فکر معاش کے دن آگے والد صاحب کی آنکھ بند ہوتے  
 ہی ہم کو اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس پوری شدت کے ساتھ ہوا۔ اور ہم  
 نے بجائے گھبرانے یا ہاتھ پیر ڈال دینے کے ایک عزم باجرم کے ساتھ کمر باندھ  
 لی اور ماموں صاحب سے کہا کہ اگر آپ ہم کو کہیں کسی تنخواہ کی کوئی ملازمت  
 دلا سکیں تو در نہ کیجئے۔ ماموں صاحب ہماری طرف سے ایک حد تک مایوس تھے اور  
 ہونا بھی چاہئے تھا۔ پڑھے نہ لکھے اور نام محمدناضل، وہ بیالے اس شش و پنج میں مبتلا  
 ہو گئے کہ ان حضرات کے لئے ملازمت آخر کس قسم کی ڈھونڈھی جائے۔ لکھنے پڑھنے بہتے  
 تو خود ان کے باپ کے بہت سے دوست تھے اور سب کے سب اعلیٰ عہدوں پر مگر اب  
 کسی سے کہا جائے تو کیا کہا جائے۔ وہ تو سوچتے ہی رہے مگر ہم نے اپنے لئے ایک جگہ  
 تجویز کر لی اور ان سے کہا کہ مجھے کوخان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کے پاس لیکر  
 چلے۔ وہ ہم لوگوں کے عزیز بھی ہیں اور آج کل روزنامہ مہدم کے منیجنگ ڈائریکٹر ہیں  
 وہ اگر مجھے کوہدم کے عمل میں لے لیں گے۔ تو میں معمولی سی تنخواہ پر بھی کام شروع کر دوں گا پکام  
 میری مرضی کا ہو گا اور اس میں خود ترقی کروں گا ماموں صاحب ان باتوں کے قائل تو نہ  
 ہوئے مگر ہم کو لیکر کوخان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کے پاس گئے سید صاحب نے پوری  
 عزیز دارانہ ہمدردی فرمائی۔ اور ہم کو اسی وقت ایک پروانہ تقرری دیدیا کہ اسے سید  
 جالب دہلوی ایڈیٹر مہدم سے کل ملنا وہ تم کو مناسب کام دیدیں گے فی الحال تنخواہ  
 چالیس روپیہ ماہوار ہے۔ اس کے بعد تم اپنی استعداد سے خود ترقیاں حاصل کرو۔

## دفترِ زمانہ مہم

دوسرے دن ہم روزنامہ مہم کے دفتر پہنچے۔ سید جالب دہلوی کاپتہ پوچھ کر ایک ایسے کمرہ میں پہنچے جہاں ایک لمبی سی میز پر چاروں طرف چار آدمی بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ اور ایک پانچویں بزرگ ایک علیحدہ میز پر اخباروں کے ڈھیر کے درمیان کاغذ پر جھلکے ہوئے نہایت تیزی سے کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ ترکی ٹوپی سے آپ شروع ہوتے تھے جس کا پھندا آگے پڑا ہوا تھا۔ اور سر کے سفید بالوں کا ایک جھوٹا ٹوپی کے آگے پیشانی پر گویا ٹوپی سے بغاوت کر کے نکل آیا تھا۔ بے ترتیب سی داڑھی کاغذ سے کچھ ہی فاصلہ پر قلم کی جنبشوں کے ساتھ حرکت کر رہی تھی۔ اور کسی کے نیچے دھول ٹانگوں کے درمیان انداز بند زمین تک اٹکتا چلا گیا تھا۔ کہ آپ بیٹھے بیٹھے اونگھ گئے ہیں اور ہم دیر تک آپ کی توجہ کے امیدوار بنے کھڑے رہے۔ آخر آپ نے دس منٹ کے بعد روزنامہ صفحہ ختم کرتے ہوئے ایک تعویذ کیا لے جاؤ، اور ذرا دیر نظر سے اس فاکسار کو دیکھا ہم عرض کیا، السلام علیکم

نہایت بیزاری سے،، وعلیکم السلام،، اس طرح فرمایا گویا کہہ رہے ہیں کہ تو خود السلام علیکم،،

ہم نے خان بہادر سید اسماعیل صاحب رضوی کا خط پیش کر دیا جس کو پڑھ کر آپ نے ہم کو پہلے تو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد ایک ہی سانس میں ہمارے خاندان کی پوری تاریخ ہم کو اس طرح سنا دی گویا آپ خود اسی خاندان کے ایک فرد ہیں۔ ہم حیرت سے سنتے رہے، اور وہ فرماتے رہے۔

آپ کے سب سے بڑے چچا حبیب احمد صاحب غالباً اس وقت ولایت  
 تشریف لے گئے تھے جب آپ پیدا بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے  
 کہ وہ پھر وہاں سے واپس تشریف نہیں لائے۔ آپ کو غالباً اطلاع ہوگی کہ وہ شہید  
 کی بہت بڑے ماہر تھے۔ اور ان کی ادبی اور صحافی اہلیت مسلم سمجھی جاتی تھی ہر چند  
 کہ وہ خود پولیس کے اعلیٰ عہدیدار تھے۔ مگر ان کی صحافی دھچکیاں پھر بھی کسی نہ کسی  
 صورت سے کارفرما نظر آتی تھیں آپ کے سب سے چھوٹے چچا منشی نیا علی احمد صاحب  
 دہلی سے ایک روزنامہ اخبار نکالتے تھے۔ اور مجھ کو مصافحت کا سب سے پہلا درس  
 وہیں سے ملا ہے۔ آپ کے والد کو البتہ اخبار نویسی یا ادب کے کسی شعبہ سے براہ راست  
 کوئی دھچکی نہ تھی۔ اور نہ غالباً آپ کے دوسرے چچا منشی سلطان احمد صاحب کو کوئی  
 دھچکی تھی مگر ان کے صاحبزادے یعنی ان کے چچا تاد بھائی ارشد تھانوی صاحب تو شاعر بھی  
 ہیں اور نہایت اچھے انشا پرداز بھی ہیں بہر صورت بہت خوش ہوں کہ آپ نے بھی اپنے  
 لئے اسی میدان عمل کو پسند کیا ہے۔ میرا احمد حسن صاحب آپ کا تقرر کر ہی چکے ہیں۔  
 میں آپ کو اس اخبار کے منیجر قاضی محمد حامد صاحب حسرت کے پاس بھیجتا ہوں وہ  
 آپ کو آپ کے فرائض کی نوعیت وغیرہ بخوبی سمجھا دیں گے۔ اس تمام گفتگو میں ہم کو یہ  
 اندازہ نہ ہو سکا کہ سید صاحب نے کہیں سائنس بھی نی یا نہیں۔ اور وہ کسی لفظ کے معنی  
 کوئی فصل تھا معلوم یہ ہوتا کہ الفاظ کی ایک زنجیر جو منہ سے نکلتی چلی آ رہی ہے  
 البتہ آواز کی جھرجھراہٹ سے یہ ضرور معلوم ہوتا تھا کہ حلق میں کوئی دھبی قسم کا ساؤنڈ  
 نکلس لگا ہوا ہے جس پر استعمال کی ہوئی سوئی لگا دی گئی ہے۔ اور ہماری خاندانی  
 روایات کا بوریکار ڈنٹر استعمال سے گھس چکا ہے۔ گراموفون کے اس سب سے پہلے

ماڈل پر بیچ رہا ہے۔ سید صاحب نے اپنی تقریر ختم کر کے کچھ لکھا اور آواز دی مے جاؤ۔  
دفتر کا ایک ملازم آیا تو اس کو وہ پرچہ دیکر ارشاد فرمایا کہ آپ کو قاضی صاحب کے  
پاس لے جاؤ۔

قاضی محمد حامد صاحب جسٹس ہدم کے منیجر بھی تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی  
آپ کا کمرہ سید جالب صاحب کے کمرہ سے زیادہ شاندار تھا۔ اور سلیقہ بھی کافی نظر آ رہا  
تھا۔ قاضی صاحب ہم سے اس طرح ملے گویا پہلے سے واقف تھے۔ اور آپ نے بغیر کچھ  
دریافت کئے اپنے ہی کمرہ میں ہمارے لئے ایک علیحدہ میز لگوا دی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ  
خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی نے قاضی صاحب کو کل ہی بلا کر ان سے  
کہہ دیا تھا کہ شوکت تھا تو می میرے عزیز ہیں۔ ان کا خاص خیال رکھا جائے۔ امیر  
ہے کہ یہ کام کے آدمی ثابت ہوں گے۔ پھر صورت ان کے متعلق مجھے پندرہ روز کے بعد  
رپورٹ کی جائے۔ اس لئے کہ باوجود عزیز داری کے میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ہدم کے  
ذریعہ کنبہ پروری کروں۔ قاضی صاحب کے لئے یہی اشارہ کافی تھا۔ لہذا آپ بہت  
ہی مہربانی کے ساتھ پیش آئے۔ اور سب سے پہلے یہ کہو یہ کام بتایا کہ آپ ہدم کے  
دو مہینے کے فائل لے کر تمام مقالات افتتاحیہ اور شذرات بڑھ ڈالئے۔ تاکہ آپ کو  
حالات حاضرہ کے علاوہ ہدم کی پالیسی کا اندازہ ہو جائے۔ اس کے بعد آپ کوئی  
تحریری کام لیا جاسکے گا۔ ہم نے ہدم کے فائل نہایت غور سے پڑھنا شروع کر دیئے  
دفتر میں بھی پڑھتے تھے۔ اور گھر بھی لے آتے تھے پڑھنے کے لئے۔ آخر تین دن میں ہم  
نے دو مہینے کے فائل پڑھ ڈالئے۔ مقالات افتتاحیہ کو پڑھا۔ شذرات پر نظر ڈالی اور  
مذاہبیہ کالم دو دو باتیں بھی پڑھ ڈالیں۔ اب قاضی صاحب نے ہم سے چھوٹے چھوٹے شذرات

لکھوانا شروع کئے اور کچھ ترجمہ کا کام ہمارے سپرد ہوا۔ تجربوں کے ترجمہ میں تو کوئی خاص بات  
 نہ تھی۔ مگر تذرات سید جالب صاحب کے پاس بھی دیئے جاتے تھے۔ بعد ازاں پرنسپل صاحب  
 صاحب سرخ روشنائی سے اس طرح اصلاح فرماتے تھے کہ تمام سیاہ عبارت پر سرخ  
 عبارت ظاہری ہو کر رہ جاتی تھی۔ اور کاغذ کو دیکھنے سے بہت چلتا تھا کہ گویا روس کی سرخ  
 - فوغ نے جلش پر حملہ کر دیا ہے۔ اور روس کے سرخ سپاہی حبشیوں کو چھاپ بیٹھے ہیں  
 شروع شروع میں تو حال یہ تھا کہ ہمارے تذرے کا شاید ہی کوئی نقطہ سید صاحب  
 کی سرخ روشنائی سے بچتا ہو مگر رفتہ رفتہ نقل عام کم ہوتا گیا۔ اب ہر سطر میں کچھ  
 سرخ نشانات نظر آنے لگے۔ اس کے بعد ہر دو تین سطروں کے بعد کچھ سرخ چھینٹیں  
 نظر آتی تھیں مگر یہ تو ارمان ہی رہ گیا کہ ہمارا کوئی تذرہ سید صاحب کے ملاحظہ سے گزرا  
 کر غیر اصلاح کے آجائے۔ سید صاحب کی بعض اصلاحیں ہماری سمجھ میں نہ آتی تھیں  
 مگر ہم چپ رہتے تھے۔ آخر ایک دن ہم نے دیکھا کہ ہمارے ایک شب لیڈر میں صرف  
 ایک اصلاح ہے یعنی آتے لکھا تھا "نقطہ نظر" اور آپ نے اس کو کاٹ کر ادھر پھینک دیا۔  
 "زاویہ نظر" اب ہم سے ضبط نہ ہو سکا اور ہم وہ سب لیڈر لے کر سید صاحب کے پاس پہنچ  
 گئے۔ اور ان سے عرض کیا "میں یہ سمجھا نہیں کہ آپ نے نقطہ نظر کاٹ کر زاویہ نظر کیوں بنادیا  
 ہے۔ میرے نزدیک تو کوئی ایسا فرق ان دونوں میں نہیں ہے" سید صاحب نے اسی طرح  
 نہایت بے پروائی سے بغیر سائنس لئے فرمایا بہت بڑا فرق ہے۔ نقطہ نظر کا مفہوم یہ ہے کہ  
 جو بات آپ کہہ رہے ہیں۔ اس کی اصلیت پر آپ کی نگاہ یقین کے ساتھ پہنچ چکی ہے  
 اور اب اس میں آپ کے نزدیک کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔ اور زاویہ نظر کا مفہوم یہ ہے کہ  
 آپ کی نظر اس نقطہ کے ارد گرد متلازم رہی ہے۔ یعنی وہ بات جو آپ ذمہ داری صرف



اسی بات کی پس جس کے متعلق آپ کو واقعی یقین ہو کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس کے علاوہ  
 کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اور جہاں تک بچت کے پہلو کسی ذمہ داری کے سلسلہ میں آپ  
 نکال سکتے ہوں نکالیں۔ زاویہ نظر کھم کر آپ نے ذمہ داری تو لے لی مگر بچت کی ایک  
 صورت بھی اپنے لئے محفوظ کر لی۔ اور نقطہ نظر کھم کر یہ ہو گا کہ ذمہ داری تو آپ لے لیں گے  
 مگر بچت کا کوئی اسکان نہ ہو گا۔ سید صاحب کا نکتہ ہمارے ذہن میں اتر گیا اور اب تک  
 اصلاحوں کے سلسلہ میں جتنی شکایتیں ہمارے دل میں تھیں سب دور ہو گئیں۔  
 سید صاحب نے کچھ ہی دنوں کے بعد ہم سے کہا کہ آپ مزاجیہ کالم "دو دو باتیں"  
 بھی لکھا کیجئے۔ لہذا ہم نے یہ کوشش بھی کی اور اس سلسلہ میں بڑے خوش نصیب ثابت  
 ہوئے کہ سید صاحب جن کے متعلق تمام علم کو یہ شکایت تھی کہ کبھی کسی کی حوصلہ افزائی  
 نہیں کرتے، دو دو باتیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور فرمایا کہ میں بچہ فیصلہ آپ کے  
 شذرارنا اور سب لیڈر وغیرہ دیکھ کر کیا تھا۔ اس لئے کہ آپ کی سنجیدہ تحریروں میں  
 جو شگفتگی ہوتی تھی۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ اگر آپ مزاجیہ کالم لکھیں تو اپنی  
 اس شگفتگی سے زیادہ کام لے سکیں گے۔ دراصل مزاج لکھنا ہے بہت ہی مشکل کام بلکہ  
 میں تو اس کو اس حیثیت سے بہت ہی بڑا درجہ دیتا ہوں کہ ایک مزاج نگار کو نہایت  
 باریک گنڈ مٹی پر چلنا پڑتا ہے۔ اس طرف ذرا سا ہٹ جائیے تو استبدال اور پھوٹن  
 کر رہ جاتا ہے۔ مزاج اور اس طرف ذرا سا ہٹ جائیے تو سنجیدہ بن جاتا ہے۔ دراصل اس  
 کے لئے قدرتی طور پر بعض طبائع ہوتے ہیں۔ اور میرا خیال درست نکلا کہ آپ مزاج  
 نگاری میں زیادہ کامیاب رہیں گے۔ سید صاحب کی طرف سے اس حوصلہ افزائی کے  
 بعد ہم نے ہمد کایہ کالم اپنے ذمے لے لیا۔ اور مستقلاً دو دو باتیں لکھتے رہے یہاں تک

کہ پنجاب کے اخباروں نے مہدم کے "دو دو بائیں" لکھنے والے کو اپنے کالموں میں باتوں کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا۔

سید عباس سب سے اب زبردقرب حاصل ہو رہا تھا پہلے ہم ان کے شاگرد تھے پھر ماتحت ہوئے اور اب وہ ہم کو اپنا خور و سخن لگے تھے۔ مگر اتنی مجال اب بھی نہ تھی کہ ہم ان سے کسی معاملہ میں بحث کرتے۔ دوسرے ڈرتے بھی تھے کہ اگر کوئی بات پوچھ لیٹھے تو پھر یہ اسی وقت بات بتائیں گے۔ بات کی جڑ بتائیں گے اور بات کے پھول پتے تک سب بتا جائیں گے۔ کسی قسم کی کوئی بات ہو، کسی فن سے متعلق، شاعری، نردوزی، معاری، ڈاکٹری، مصوری، موسیقی، خیاطی، عرض تو کیا کہ دنیا کے کسی شعبہ کو لے لیجئے اور سید صاحب سے کسی بات کے متعلق کچھ پوچھ لیجئے۔ بس آپ کے چھپے پڑ جائیں گے۔ اور جب تک اس بات کے سلسلہ میں آپ میں ڈاکٹریٹ کی قابلیت پیدا نہ کر دیں گے "اے نہ زبان لگائیں گے۔ نہ سانس لیں گے غلطی سے پوچھ لیا کہ سید صاحب آپ یہ حقہ کسی خاص اہتمام سے بھر داتے ہیں یا جس تبا کو کا ہو۔ اور جس طرح چاہے بھر دیا جائے۔ آپ پی لیتے ہیں لیجئے سید صاحب شروع ہو گئے کہ "جی ہاں حقہ کے سلسلہ میں میری پسند تو خاص کوئی بھی نہیں ہے۔ مگر میں کھنڈ کے خمیرے میں گور کھپو کا تبا کو ملا کر زیادہ پسند کرتا ہوں دراصل میں بچپن ہی سے حقہ کے مرض میں مبتلا ہوں۔ والد صاحب میرے لئے میرٹھ کی نوخیدی سے ایک خوبصورت سی گڑگری ہر سال لایا کرتے تھے۔ اور میں اس کو عمل میں لبا کر استعمال کرتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ اہتمام ختم ہو گیا اور حقہ کے سلسلہ میں میں نے جب غور کرنا شروع کیا تو عظیم الشان خانی حقہ سے لے کر کھنڈ کے حقہ تک سب ہی کامزہ چکرا اور آخر میں اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ خالص حقہ پنجاب کے لوگ پیتے ہیں ان کی تبا کو

میں کسی قسم کی آئینہ نش نہیں ہوتی میں نے پنجاب کی اس تمباکو کو گنڈے کی آگ رکھ کر پیا ہے اور میری رائے یہ ہے کہ حق کے لئے سب سے بہتر آگ گنڈے کی ہوتی ہے جس کی آہٹ میں ایک قسم کا توازن ہوتا ہے اور تمباکو ایک دم بھر گنڈے یا قبل از وقت بجھنے نہیں پاتی۔ یہ سٹک وغیرہ تو دراصل امراء کے تکلفات ہیں، حالانکہ طبی حیثیت سے سٹک کا استعمال یوں بھی مفید ہے کہ دھواں زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر کے آتا ہے۔ دوسرے بھی پتھر ڈال کے لیے ایک قسم کی ورزش کا ارکان بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اب کہاں تک اس سلسلہ میں لکھا جائے۔ سید صاحب اسی حق کے سلسلہ میں نظامِ سقہ کے حق سے لے کر دیو جانس کلی کے حق تک پہنچ کر بھی دم نہ لیتے۔ حق کے تمام اقسام نیچوں کی خستہ جلموں کی قسمیں۔ تمباکو بنانے کے مختلف طریقے۔ ہر قوم میں حق کی جدا گانہ روایات۔ حق کے بعد سگریٹ کی ایجاد اور اس کی ضرورت پائپ اور سگار مختصر یہ کہ سب ہی پر روشنی ڈالتے اور مختلف تمباکو فروشوں کے شجرے پیش کرتے چلے جاتے تھے۔ اور علوم یہ ہوتا تھا کہ ان حضرات نے زندگی بھر حق ہی سے متعلق تحقیق و تفتیش کی ہے۔ مگر نہیں ان سے تو جس موضوع پر بھی گفتگو کیجئے۔ اسی ہمہ دانی کا قائل ہونا پڑتا تھا۔ دستہ ہیں ہر روز نہ جانے کتنے لوگ آپ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ اور آپ ان میں سے ہر ایک کے خاندان سے اس قدر واقف و لطف فرماتے تھے۔ کہ شاید وہ لوگ خود بھی نہ جانتے ہوں گے۔ نہایت وثوق سے کہہ دیا کرتے تھے کہ جی ہاں آپ کو نہیں معلوم ہے مگر آپ کے والد محترم کے عم محترم کی خالہ صاحبہ محترمہ کے پاندان کی تمباکو، الہ اکھیا سے یہ تعویذ برآمد ہوا تھا دراصل یہ تعویذ خان خاناں بیرم خاں سے ہوتا ہوا راجہ ٹوڈرل کے پوتے کے پاس پہنچا۔ اور وہاں سے میری ہدیٰ بھرتی کے خسر محترم میر گھسیٹے کے پاس آیا جو یہ

تعوذتوں غائب رہا۔ اور آخر کار جتنا کے کنارے بمقام کالپی ایک خزانہ عبداللہ  
 نامی ایک نعل بند کو ملا۔ اس نے آپ کے والد محترم کے عم محترم کی خالہ محترمہ کے  
 شوہر شوہر امانت علی خاں صاحب کو وہ تعویذ دے دیا تھا۔ اور اس طرح آپ  
 کے خاثران تک یہ تعویذ آیا۔ اب وہ حضرت اور باقی تمام سامعین حیران رہ جاتے  
 تھے کہ سید صاحب کو آخر یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں۔ اسی طرح وہ ہر بات اور  
 ہر روایت سے اس قدر باخبر تھے کہ ان کو زندہ انسانیکلو پیڈیا کہنا غلط نہ ہوگا۔ انیویسٹ  
 شوق فرماتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں اپنے گورنڈ مشرب کہا کرتے تھے۔ سید صاحب کی  
 کچھ دنوں کے بعد منتظلمین سے ان بن ہو گئی اور آپ ہمد م سے علیحدہ ہو گئے۔ اس موقع  
 پر سید صاحب کو علم نے ایک رخصتی پارٹی دی۔ چنانچہ فوٹو گروپ کے لئے سید  
 صاحب نے خاص طور پر اہتمام سے صاف کپڑے پہنے۔ اور سیاہ شیریوانی زیب تن  
 فرمائی۔ مگر اسی سچ و سچ کے ساتھ یعنی اوپر کے تین بیٹن بند باقی سب کھلے ہوئے ہاتھ  
 جھڑی اور چھڑی اور ہاتھ کے بیچ میں ایک بڑا سا رومال ڈوری دار سیاہ جوتا مگر ڈوریا  
 کھلی ہوئی ہیں۔ نعرہ کی سید صاحب جوتے کی ڈوری تو باندھ لیجئے۔ اس کا جواب  
 آپ کے صاحبزادے عشرت صاحب نے دیا کہ ”عاجبت مشا طہ نیست“ میں نے  
 ”روئے ولا رام“ کبھی تو کہئے۔ سید صاحب نے کہا ”جہاں میاں عشرت جو جہاں ہیں  
 اتنا ہے کہ جاتے ہیں“ سید صاحب کے متعلق زیادہ تفصیل میں جانے کی رہاں  
 گنجائش نہیں ہے۔ میں ایک مستقل مضمون سید جالب دہلوی لکھ چکا ہوں اور یہ  
 میں بھی سید صاحب سے لوگ مل چکے ہوں گے۔

سید جالب دہلوی کے بعد ہمد م کی ادارت ایک ہفتہ تک ملک ٹھہرالشہ خاں

نزیر سابق مدیر، مدینہ میجنور نے فرمائی۔ آپ کے بعد قاضی محمد حامد صاحب حسرت  
نام مقامی کرتے رہے۔ اور دو دن اس خاکسار کے پاس چارج رہا پھر چوہدری رحم علی  
صاحب ہاشمی نے باضابطہ ادارت سنبھالی

## چوہدری رحم علی ہاشمی

چوہدری رحم علی ہاشمی سے بھی لوگ شیش محل میں مل چکے ہوں گے۔ آپ ایک  
کہتے۔ عشق ہونے کے علاوہ اردو اور انگریزی سب نلزم کے بہت سے گرم و سرد  
کا تجربہ حاصل کیے ہوئے تھے۔ اسی ہدم میں پہلے بھی رہ چکے تھے۔ اس کے بعد متعدد  
اردو اور انگریزی اخبارات کو دکھانے لگا چکے تھے۔ آدمی بہت عمدہ، نہایت شریف  
اور بیدنیاس تھے۔ ہم لوگ ان کے ماتحت کم اور دوست زیادہ تھے، کھلانے  
پالنے والے آدمی تھے۔ اور اس میں دراصل آپ کا ذاتی تصور بھی نہ تھا۔ آپ کی بیگم  
صاحبہ اس سلسلہ میں بہت ہی دریا دل واقع ہوئی تھیں اور آپ کی دال گھر میں  
کبھی نہ گلتی تھی۔ سید جالب صاحب کے زمانہ میں تو دفتر محض دفتر تھا مگر اب  
دفتر کی حیثیت دفتر کے علاوہ کلب کی سی ہو گئی تھی۔ بیگم ہاشمی اکثر دعوتیں کرتی رہتی تھیں  
آشرفی مراد تقریباً روز ہر خصوصاً ہمارے لئے کچھ راشن مقرر ہو گیا تھا۔ مثلاً  
دوپان صبح، دوپان شام، چار اور کبھی اگر کوئی خاص چیز ملی تو وہ ہاشمی صاحب  
بہت شوق سے آکر کہتے تھے کہ بیگم نے آپ کو کھاتے پر یاد کیا ہے۔ ماش کی کھچڑی کے  
میں بیگم ہاشمی کو ہماری کمزوری کی اطلاع مل چکی تھی۔ لہذا وہ اکثر اس سلسلہ  
میں یاد دہانی دیتیں پھر بیگم ہاشمی نے بٹوے بنا کر عنایت فرمانا شروع کیے جن کا

سلسلہ اب تک قائم ہے قصہ مختصر یہ کہ ہم نے ان کو بہت جلد اپنا لیا۔ اور اس سلسلہ میں ہمیشہ فائدے میں رہے۔ پانوں کی نہایت خوبصورت شخص پوش ڈالیاں ہم کو ملنے لگیں کھائی اور ناشتہ میں پہلے بحیثیت دیور کے جو خطرے قدم قدم پر رہا کرتے تھے۔ وہ دور ہو گئے مثلاً ایک مرتبہ نہایت صبر آزمائے قسم کے سنبو سے تیار کئے گئے۔ اور اب جو ہم کھاتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ان میں گھاس بھری ہوئی ہے۔ ان حالات کے ماتحت عافیت اسی میں نظر آئی کہ چپکے سے ان کے شوہر کا سہلا ہونا منظور کر لیں خود ہاشمی صاحب کی جوگت بنا کر لی تھی۔ ہمارے لئے بچہ سبق آموز تھی۔ ہاشمی صاحب کی تمام قابلیت اس گھوڑا سواری کے سامنے بلبلیں جہاں تکنے لگتی تھی۔

ہمدم کا یہ دور بہت ہی ہنستے کھیلتے گزر رہا تھا۔ ہمارے سب ساتھی امتیاز احمد صاحب اشرفی مرحوم یعقوب خاں صاحب کلام وغیرہ آپس میں دوست اور ایک دوسرے کے صحیح معنوں میں ہمدرد تھے۔ خود ہاشمی صاحب نہایت نیک نفس آدمی تھے۔ اور اب چونکہ ہماری مشق کافی بڑھ چکی تھی۔ لہذا ہمارے ذمہ جتنے کام تھے وہ گویا خود بخود ہو جایا کرتے۔ اس زمانہ میں ملک کے ادبی رسائل میں بھی کافی لکھا۔

## نسیم انہونی

ہمدم کا یہی دور تھا کہ ایک روز جناب وصال بلگرامی کے بھیجے ہوئے ایک خطا ہمارے پاس تشریف لائے آنکھوں میں سرمہ پیروں میں لغزش آواؤں میں عروہ اور ایک عجیب الطرزین معلوم ہوا کہ آپ سید محمد نسیم صاحب انہونی ہیں۔ اور رسالہ انکشاف کے ایڈیٹر ہیں۔ رسالہ کا تازہ پرچہ سامنے لائے تھے۔ اور رسالے کے لئے

قلمی معاونت چاہتے تھے۔ ان حضرات میں اپنی طرف متوجہ کرنے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ ہم نے قلمی معاونت کا وعدہ کر لیا۔ اور اپنے مضامین دینے کے علاوہ دوسروں کے مضامین دلوانے کا وعدہ بھی کر گزے۔ اب کیا تھا۔ نسیم صاحب سے روز ملاقات ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ہم کو ان کے دفتر جانا پڑا۔ جو انجمن عالیہ ایک آنہ فنڈ کے دفتر کے ایک گوشہ میں تھا یہ رسالہ دراصل اسی انجمن کا پرچہ تھا مگر اب تک اس سے کام صرف یہ لیا جاتا رہا کہ چند دینے والوں کا شکریہ دستاویزی صورت میں پیش کر دیا جائے مگر نسیم صاحب نے اس کو ادبی شکل دینا چاہی اور وہ بے حد کامیاب ہوئے۔ انجمن کے سرسید ناسکرٹیری مولوی سید خلیل احمد صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ جو بڑے خود شخصیت کے اعتبار سے ایک ادارہ معلوم ہوتے تھے معلوم ہوا کہ آپ شعر بھی کہتے ہیں۔ اور غمزہ، تخلص البتہ ہم کو کچھ عجیب اور کچھ طویل سا معلوم ہوا۔ جیسے کوئی اپنا تخلص ”کانپور“ رکھ لے۔ بلکہ گولہ گوگرد ناکہ ارادہ کیا کہ ان سے کہیں کہ اتنا ہی بڑا تخلص رکھنا تھا تو ایک آنہ فنڈ تخلص کیوں نہ رکھا مگر یہ دیکھ کر چپ ہو گئے کہ ان کے یہاں کی تو ہر چیز زالی ہے۔ مثلاً پاخانہ پرسائیں بورڈ لگا رکھا تھا۔ صحت خانہ، نہ جانے کتنے آدمی ہسپتال کے دھوکے میں وہاں پہلے گئے ہوں۔ سید خلیل احمد صاحب جیسے نہایت عمدہ آدمی ثابت ہوئے، یکے مردوں اور عورتوں کی تو ایک خاص پہچان بتائی گئی ہے۔ شرمیلا ہونا۔ یہ بات تو ان میں اس حد تک نظر آئی کہ سرسید ناکہ وارٹھی اور پھر ان دونوں کی آمیزش سے انسان چکر کر رہ جاتے

نسیم صاحب ہمیشہ رسالوں کے معاملہ میں بڑے اوالاعزم نسیم کے آدمی ہیں۔



خوب خوب نمز کاتتے ہیں۔ چاہے دیوالہ ہی کیوں نہ نکل جائے۔ دل کے ارمان مگر ضرور پورے کریں گے۔ وہ اپنے زیر اہتمام نکلنے والے پرچوں کے خاص نمبر اس طرح نہیں نکالتے کہ یہ اخباروں یا رسالوں کے خاص نمبر ہیں۔ بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اولادوں کی شادیاں ہیں چنانچہ اس زمانہ میں بھی انکشاف کے مختلف خاص نمبر نکلے۔ ایک نمبر تو ایسا تھا کہ اس کا سرورق لیدر پیر کا تھا۔ بے شمار تصویریں دیتے تھے بہتر سے بہتر مضامین جمع کرتے تھے۔ اور آخر کار جس وقت وہ خاص نمبر ریس سے لے کر آتے تھے چہرہ پر انبساط کی لہریں ہوتی تھیں۔ گویا دلہن یاہ کر لائے ہو یا اب ان خاص نمبروں کی تشبیہ میں ہم بھی برابر کے شریک تھے۔ اور نسیم صاحب اور ہائے درمیان بنیر کسی تسمبیہ سے گویا فیصلہ ہو گیا تھا کہ ہم ان کی تجارتی صلاحیت کو سراہتے رہیں۔ اور وہ ہمارے ادبی حیثیت کا اعتراف کرتے رہیں۔ ہم نے تو طیران کی ادبی حیثیت کا بھی اعتراف کرنا چاہا تھا مگر وہ اس سلسلہ میں کچھ سنجیدہ نظر نہ آئے۔ انسانی سکتے تھے۔ اور خوب لکھتے تھے۔ مگر اس کو کوئی ادبی کارنامہ نہ سمجھتے تھے البتہ اگر ان کی کسی تجارتی رمز کو سمجھ کر ہم نے کبھی داد دے دی۔ تو وہ اپنی آنکھوں میں ایک خاص خوشی کی چمک پیدا کر کے ہم کو اس طرح دیکھنے گویا نہایت سمجھدار آدمی سمجھ رہے ہیں نسیم صاحب کی تجارتی حیثیت اور صلاحیت کو ہم زیادہ نمایاں نہ کر سکے۔ مگر ہماری ادبی صلاحیت کو وہ برابر اچھا لے رہے۔ اور آج تک اچھا لے رہتے ہیں۔ ہمارے ہر ادبی کارنامہ پر دوستوں میں ان سے زیادہ خوش ہونے والا آج بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ یہ سمجھ کر خوش نہیں ہوتے کہ یہ شوکت کا کارنامہ ہے بلکہ ان کو تو سمجھ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ گویا یہ ان ہی سے متعلق کوئی چیز ہے۔ نسیم صاحب کا ذکر اس تذکرہ میں بار بار آئے گا۔ اور ان کی شخصیت

کے مختلف پہلو نمایاں ہوں گے۔ اس موقع پر اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اب ہم کو ایک ایسا ذریعہ مل گیا تھا کہ ہم اپنی ادبی سرگرمیوں کو جس طرح چاہتے جاری رکھ سکتے تھے۔

## مولانا سیما سے جنگ

حضرت سائغر نظامی اور مولانا سیما سے ہمارے تعلقات اب تک نہایت شگفتہ تھے۔ ۱۹۲۳ء سے یہ مراسم تھے۔ اور اب تک کوئی بات ایسی نہیں ہوئی تھی جس سے ناگواری کا کوئی پہلو کسی طرف سے نکلتا ہو۔ مگر آج کل مولانا سیما کی ادارت میں اگر ہ سے ایک اخبار نکل رہا تھا۔ تاج اور اس اخبار میں ایک آدھ بحث ایسی ناگوار چھڑ گئی جس کا جواب ہم کو ہدم میں دینا پڑا مولانا کے اخبار میں اس کا چھہ سخت جواب دیگیا اور آخر باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ ہدم کا ”دو دو باتوں“ والا کامل مولانا کے لئے وقف ہو گیا مولانا نے اپنے اخبار کے علاوہ اپنے ایک شاگرد خواجہ ستار احسن جمیل کے اخبار فرشتہ میں بھی ہدم کے خلاف کچھ لکھوا نا شروع کیا فرشتہ کی ایک تحریر کا جواب لکھتے ہوئے ہم نے ہدم میں لکھ دیا کہ ”فرشتہ تو فرشتہ اس کے معلم الملکوت تک کے فرشتوں کو کیا اس کی خبر نہیں کہ ہدم روزانہ اخبار ہے۔ اور یہ گنڈے دار چھینے والے ہفتہ دار اخبار اس کی روزانہ کی چوٹوں کا اگر ہفتہ میں ایک بار جواب بھی دے سکیں تو بھی ہفتے کے باقی چھ دن سہلاتے گزر جاتیا کریں گے وغیرہ“ اس میں فرشتہ کی رعایت سے معلم الملکوت والے چوٹ کی تاب مولانا نہ لاسکے اور تاج کے دوسرے ہی نمبر میں ان کا مظلوم پیغام ہدم کے یاتونی کے نام پھینکا جو چارے ذہن میں اس طرح محفوظ رہا

گنیا ہے کہ سہ

اور باقی ہے اور نہ استعداد باقی ہے ۔  
فقط طاغوتوں کی فکر اور زاد باقی ہے  
کوئی ہمدم کے باقونی سے جا کر صرف یہ کہہ  
کہ شیطان مر گیا اس کی لگا اور لا باقی ہے

اس کے بعد بھی بہت دنوں تک اس لڑائی کا خاتمہ نہ ہوا اور ادھر سے ہدم  
ادھر سے تاج اور فرشتہ برابر ایک دوسرے کے خلدن کچھ نہ کچھ لگتے تھے۔ آخر ایک دن  
ہاشمی صاحب کی رائے یہ ہوئی کہ اب اس جنگ کو ختم کر دینا چاہئے۔ چنانچہ مولانا سیما  
کی تازہ غزل پیانہ کے تازہ پر پہ میں چپی تھی۔ ع

میت نہ مری جا کر ویرانے میں رکھ دینا  
ہم اس پر تنقید کی اور تمام اشعار پر تنقید کر پکڑنے کے بعد مقلع پر پہونچے سہ  
سیما حقیقت میں فطرت کا تمسخر ہے  
جذبات کی اک بجلی پر دانے میں رکھ دینا  
تو ہم نے لکھ دیا کہ اب جب کہ مولانا نے خود یہ کہہ دیا ہے کہ ع  
سیما حقیقت میں فطرت کا تمسخر ہے

ہم کو مولانا کے متعلق اب کچھ نہیں کہنا ہے اور ہم آج اس بحث کو ختم کر رہے ہیں  
اس ناگوار بحث کے بعد جب مولانا سے پھر ملاقات ہوئی تو ان کا دل بالکل صاف  
تھا اور ہم بھی ان سے شکی نہ تھے ساغر صاحب سے بھی خوشگوار تعلقات قائم رہے  
اور مولانا سیما کو آج بھی ہم اپنا محترم بزرگ سمجھتے ہیں اس اخباری لڑائی کو ہم دونوں

بھول چکے ہیں اور اگر ہم تھوڑی سی خیانت کر سکتے تو اس تذکرے میں بھی اس ذکر کے آنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

## سودشی ریل

ابھی ہم ہم ہی میں تھے۔ اور اخبار کی ذمہ داریوں سے جو فرصت ملتی تھی اس کو دوسری ادبی و جیسیوں میں صرف کرتے تھے مختلف رسالوں کے لئے لکھا کرتے تھے۔ اور اب زیادہ تر نگاہیں چیزیں لکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں رسالہ نیرنگ خیال لاہور کے سالنامہ ۱۹۳۳ء کے لئے ہم نے ایک مزاحیہ افسانہ سودشی ریل کے نام لکھا۔ اس افسانہ کے پچھلے ہی نیرنگ خیال کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کا ایک تھمبیلی خط ہم کو ملا جس میں اس افسانے کی بے حد تعریف کی تھی۔ ہاشمی مرحوم سے ہم بالکل واقف نہ تھے کہ اس سے پہلے کبھی خط و کتابت ہوئی تھی۔ ہم نے اس نیرنگ خیال کو پوچھا کہ یہ سب کچھ کر سہ سہی سا شکریہ ادا کر دیا مگر سالنامہ نیرنگ خیال کے شائع ہونے کے بعد اب جیسے دیکھتے ہیں ہم کو خط لکھ رہا ہے بہت سے مقامی حضرات ملتے آئے۔ متعدد رسالوں اور اخباروں نے اس کو نقل کیا۔ ہندی، بنگالی اور مرہٹی اخباروں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے یہاں تک کہ ڈاکٹر شفیع صاحب کوئی بزرگ ہیں انھوں نے اس کا انگریزی ترجمہ ولایت کے محبوب نامی کسی اخبار میں چھپوا دیا۔ یہ ترجمہ ہم نے خود نہیں لکھا مگر اکثر لوگوں نے یہ روایت سنائی جس کے معتبر ہونے میں ہمیں آج بھی شک ہے مگر مختلف اردو ہندی، بنگالی اور مرہٹی اخبارات جن میں یہ افسانہ نقل ہوا یا ترجمہ کر کے چھاپا گیا

ان کی تعداد چھپن ہے اور لوگوں کا خیال ہے کہ اسی افسانہ نے ہم کو مزاح نگاروں میں باضابطہ طریقہ پر مثال کر دیا۔ بلکہ اس دور کے بعض تذکرہ نویسوں نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "شوکت قانوی کی مقبولیت کا سنگ بنیاد ان کا افسانہ سودیشی ریل ہے" اس افسانہ کی غیر معمولی مقبولیت کے بعد مختلف باتیں مشہور ہوئیں مثلاً یہ کہ پیرکاری پر ویگنڈے کے لئے لکھا گیا ہے۔ اور کسی سرکاری اشتاعت کے ماتحت لکھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ایک دوسری عجیب بات یہ بھی کہی گئی کہ یہ افسانہ کسی انگریزی افسانہ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی بالکل غلط ہے۔ یہ افسانہ قطعاً طبعاً اور بغیر کسی تحریک کے لکھا گیا تھا۔ اس افسانہ کا مقصد دراصل یہ بھی نہ تھا کہ اس سے قومی جذبات اور قومی تخیل کو کوئی حسد پہونچے بلکہ یہ ایک فاضل مزاحیہ چیز تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

## سودیشی ریل کے بعد

سودیشی ریل کی مقبولیت کے بعد اب جس کو دیکھئے۔ وہ ہم سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ کوئی سودیشی چیز لکھ دو اور تو اور خود ایدیسٹر نیرنگ خیال نے سودیشی ریل کے دوسرے حصے کا مطالبہ کیا۔ ہم نے ان تمام فرمائشوں کی تعمیل کر دی مثلاً نیرنگ خیال کے لئے ایک مضمون لکھا۔ سودیشی ریل کے بعد "نسیم انہو توئی کی فرمائش پر دو تین مضامین لکھے۔ سودیشی ڈاکستان، سودیشی کونسل اور سودیشی عدالت وغیرہ مگر ان میں سے کسی میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ دراصل ان مضامین کا لکھنا ہی ہماری غلطی تھی۔ ہم کو سودیشی ریل کی اس مقبولیت سے خود متاثر نہ ہونا چاہئے تھا

اور سودیشی ریل ہی کو معراج سمجھ کر اسی کے ارد گرد رہ جانے کی کوشش نہ کرنا تھی۔ مگر یہ باتیں اس وقت نہ ہم خود سمجھ سکے نہ کوئی ہم کو سمجھا سکا۔ نتیجہ یہ کہ سودیشی سفایں لکھ کر ہم نے انتہائی کمزوری کا ثبوت دیا۔ اس میں شک نہیں کہ سودیشی ریل کے بعد ہماری ادبی و محنت بہت بڑھ گئی تھی۔ کہ ہم کو یہ بھی سمجھنا چاہئے تھا کہ اب پڑھنے والے ہم سے سودیشی ریل طلب نہیں کر رہے ہیں، بلکہ اس سے لگے بچہ اور، اور ہم کر یہ ہے تھے کہ سودیشی ریل پر بیٹھے ہوئے اپنی منزل طے کرنا چاہتے تھے، حالانکہ خود ہی لکھ چکے تھے کہ اس بے چاری میں کوئلہ ہی نہ تھا۔ اور نہ اس کی کوئی سمت مقرر تھی کہ مشرق کی طرف جائے گی یا مغرب کی طرف بلکہ طے یہ تھا کہ جس طرف کے مسافر زیادہ ہو جائیں گے اسی طرف اس کو چھوڑ دیا جائے گا۔

## اور وہ اخبار

ابھی ہماری ادبی حیثیت پوری طرح پختہ بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ملازمت خطرہ پر پڑ گئی یعنی یہ خبر مشہور ہوئی کہ ہدم بند کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا ہے اس خبر کی تحقیقات شروع کرنے بھی نہ پاسے تھے کہ تصدیق آگئی۔ اور ہدم واقعی بند کر دیا گیا۔ لیکن ملازمت ختم اور اب ہمارا اللہ حافظ۔ اب تک ہم نے رسالوں کے لئے جو کچھ لکھا تھا اس کا کوئی معاوضہ کہیں سے نہ آیا تھا۔ نسیم صاحب کے لئے جس قدر کام کرتے تھے اس کے معاوضے کا تو ظاہر ہے کہ کوئی سوال ہی نہ تھا۔ مختصر یہ کہ ہدم کے بند ہونے کے بعد ہم کو ایک مرتبہ پھر دنیا میں کچھ خلا سا محسوس ہونے لگا۔ مگر ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ہم اطلاع ملی کہ روزنامہ ”اور وہ“ اخبار کے لئے ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت ہے لہذا ہم اور وہ اخبار کے دفتر پہنچے، اور سید نور الحسن صاحب سے ملے جو اور وہ

اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ ہم نے معلوم نہیں کیوں اسے یہ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ کہ ہم ملازمت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ حاضری کی وجہ یہ بتادی کہ ہم کو ادھر اخبار میں کچھ اشتہار شائع کرانا ہیں اور چونکہ اب تک ہم آپ کی برادری کے ایک رکن تھے مگر وہ بھی کچھ شرمائے سے جاتے تھے۔ آخر جب ہم اشتہارات کا نرخ وغیرہ معلوم کر چکے تو نور الحسن صاحب نے ایک مرتبہ جی کڑا کر کے ہم سے کہہ دیا کہ ”ہم سے آپ الگ ہو گئے ہیں تو ادھر اخبار میں آجائیے“ ہم نے کوئی اشتیاق تو ظاہر نہیں کیا اور نہ یہ راز کھلنے دیا کہ ہم کو منہ مانگی مراد مل رہی ہے البتہ یہ کہہ دیا کہ میں یہاں کے حالات سے واقف نہیں ہوں معلوم نہیں آپ کیا تنخواہ دلوا سکیں گے۔ اور کیا شرائط ہوں گے۔ تمام باتیں مجھے معلوم ہوں تو میں غور کروں گا۔ سید نور الحسن صاحب نے تفوٹھی دیر میں تمام حالات ہم پر واضح کر دیئے اور اسی دن ہم اس اخبار کے باوا آدم کے محلہ اوار ستا میں آگئے بعد میں معلوم ہوا کہ خود سید نور الحسن صاحب مستقل ایڈیٹر نہ تھے۔ بلکہ اخبار کے ایڈیٹر صاحب بغرض تبدیل آپ وہاں ڈرائیو تک گئے ہوئے تھے۔ لہذا آپ ان کی قائم مقامی کر رہے تھے۔ مگر اخبار پر آپ کا نام قائم مقام کی حیثیت سے نہیں بلکہ مستقل ایڈیٹر کی حیثیت سے لکھا رہا تھا۔ بہر صورت ہم کو آدم کھانے سے غرض نشی۔ پیر گنتے سے کیا واسطہ۔ ہم نے کام شروع کر دیا۔ ہدم والی۔ دو دو باتیں۔ کو اس اخبار میں شروع کیا۔ اور اپنے ذمہ اس مزاحیہ کالم کے علاوہ پورا ایڈیٹر کیل کا صفحہ لے لیا کبھی سید نور الحسن ایڈیٹر لکھتے تھے اور ہم شذرات اور دو دو باتیں کبھی وہ شذرات لکھتے تھے۔ اور ہم لیڈر اور دو دو باتیں دراصل اس وقت اس اخبار کی حیثیت اخبار کی تھی ہی نہیں بلکہ راکار اخبار کا مقصد صرف یہ تھا کہ چونکہ منشی



نو لکھنؤر صاحب انجمنی نے اس اخبار کو جاری کیا تھا۔ لہذا یہ منظرہ بطور ان کی قصو  
 کے نکلتا ہے جس طرح بھی نکلے۔ البتہ چونکہ بہت پرانا اخبار تھا لہذا اولاً یہی کمپنیوں  
 کے اشتہارات اس کے پاس بہت کافی تھے۔ مگر پھر بھی غالباً خسارہ میں چل رہا تھا  
 ہم نے اس اخبار کے دفتر میں کام کر کے یہ تماشہ دیکھا کہ جس کا جس وقت جی چاہا چلا  
 آیا۔ اور جو جی چاہا کیا۔ کوئی پرسان حال نہ تھا شو ریڈیٹر صاحب اس قدر کم سخن تھے  
 کہ کسی سے کچھ کہہ ہی نہ سکتے تھے علم ادارت والے یہ کرتے تھے کہ قلم سے زیادہ قلمی سے  
 کام لیا جاتا تھا۔ اس اخبار سے ایک خبر کاٹ کر اس اخبار سے ایک مضمون لیا  
 کاتب نے زیادہ تقاضہ کیا تو کسی اخبار پر پینسل سے نشان بنا دیا۔ اور لیجئے  
 اخبار تیار تھا۔ صرف ایڈیٹوریل والا صفحہ ایسا ہوتا تھا جسے لکھنے کی ضرورت  
 پیش آتی تھی۔ اور کبھی کبھی کچھ خبروں کے ترجمے بھی کر لے جاتے تھے۔ سید نور الحسن  
 صاحب سے کچھ ہی دنوں میں نہایت بے تکلفی ہو گئی۔ ایسی بے تکلفی کہ اب یہاں بھی  
 کلب کی سی فضا پیدا ہونے لگی۔ ایک قسم کا پنچ ہم لوگوں نے ایجاد کیا جو روز گیارہ  
 بجے کھایا جاتا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ علم ادارت کے چار ممبروں سے جو صاحب  
 سب کے بعد آتے تھے وہ ایک روپیہ کی مٹھائی منگوا کر آتے تھے۔ یہ تو ظاہر  
 ہے کہ مختلف مقامات سے آنے والے سب ایک ساتھ دھڑ میں پہنچ نہیں  
 نہیں سکتے تھے۔ کوئی نہ کوئی دیر میں پہنچتا ہی تھا۔ دیر کی مراد دفتر کی حاضری  
 کے وقت سے نہیں۔ بلکہ یوں بھی جو دیر میں آئے وہی اس دن کے پنچ کا ذمہ دار  
 ہوتا تھا۔ اثر یہ بھی ہوتا تھا کہ دو ممبر ایک دم سے ساقف صاحب پر پہنچے اور دروازے  
 سے دفتر کے کمرے تک سارے زور کی دونوں میں دوڑ ہوئی کہ کیا سول

سر دس کپ کے گھوڑے دوڑیں گے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دستہ کی حاضری  
 کے مقررہ وقت سے پہلے ہی ہم لوگ پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور جب  
 بھی پہنچتے تھے۔ بلدیہ پر شاد لہرے نامی ایک بزرگ تھے۔  
 ان کو ہمیشہ موجود پاتے تھے۔ اس سلسلہ میں کبھی ایک دن کا جرمانہ بھی ان پر نہیں  
 ہوا۔ معلوم نہیں وہ رات کو بھی دفتر میں سوتے تھے۔ یا گیا۔ باقی رہ گئے عین معبران  
 میں سب سے زیادہ جرمانے سید نور الحسن صاحب خود ادا کرتے تھے۔ حالانکہ ذرا  
 سب سے زیادہ ہم کو ملے کرنا پڑتا تھا۔ ہم و کٹوریہ اسٹریٹ سے حضرت گنج بہشت  
 تھے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد معلوم یہ ہوا کہ سید نور الحسن صاحب جیل سے واپس۔  
 آئے۔ یہاں سید نور الحسن صاحب نے استعفیٰ دیدیا۔ اور ہم کو قائم مقامی کرنا  
 پڑی۔ اب ہم ادوہ اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ اسی زمانہ میں منشی شبن نرائن صاحب  
 کا انتقال ہو گیا۔ جن کو کشور اسٹیٹ کے مالک تھے۔ اور تمام اسٹیٹ مع اخبار  
 کے کورٹ آف وارڈس میں چلا گیا۔ اس لئے کہ نئے مالک کے بالغ ہونے میں  
 کچھ عرصہ تھا۔ اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیل سے آنے کے باوجود یہ ایڈیٹر صاحب  
 اخبار کی ادارت پر واپس نہ آ سکے۔ اور ہم خوش تھے۔ کہ ہمارا نام اس جگہ نکل  
 رہا ہے۔ جہاں اب سے پہلے پنڈت اتن ناتھ سرشار ایسے بزرگوں کا نام نکل چکا  
 ہے۔ مگر ہمیں ایک خرابی تھی کہ ہم نہ تو کبھی پنڈت شبن نرائن بھارگوں پنہالی سے  
 ملے تھے۔ اور نہ نول کشور اسٹیٹ کے کسی اور ذمہ دار سے ملنے کی کبھی کوشش  
 کی تھی۔ اور نہ اب کورٹ آف وارڈس کے افسران سے ملنے کی کوشش  
 کرتے تھے۔ جو ہماری قسمت کے گویا ذمہ دار بن چکے تھے۔ لہذا وہاں اندر ہی

اندر ایک کچھڑی یکی اور ایک اور صاحب کو اختیار کی ادارت پر بلا کر ہم کو یکسور  
 اسسٹنٹ ایڈیٹری پرواپس کر دیا گیا۔ ہم اس پر بھی بدول نہیں ہوئے  
 اس لئے کہ اتنے دنوں تک اخبار کو سنبھالنے کا ہم کو کوئی مزید سولہ نہیں ملا  
 تھا۔ جو تنخواہ ملتی تھی وہی ملتی رہی، ایک صاحب نے یہ بات بالکل سچی کہی تھی  
 توں کشور اسٹیٹ کی ملازمت تو گویا ایک قسم کی بخشش ہے جو ہمیشہ ملتی رہتی ہے  
 نہ کام کی کوئی مداخلت پوچھ گچھ ہوتی ہے۔ نہ برطانی کا کبھی سوال پیدا ہوتا ہے۔ مگر  
 سوال تو یہ تھا کہ کیا زندگی بھر اسی تنخواہ پر ہمیشہ رہنے کیلئے مجبور رہے۔

## موج تبسم

نسیم صاحب نے ہمارے مضامین کا پہلا مجموعہ "موج تبسم" کے نام سے شائع  
 کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ گویا ہماری پہلی کتاب تھی۔ اور مصنف بننے کے شوق میں ہم بھوک  
 پیاس بھولے ہوئے تھے کتابت کے دوران میں کاتب کا گویا ناکسایا دم  
 کر رکھا تھا۔ طباعت کے وقت پریس میں نقص آتے تھے۔ کاپیاں رینگ  
 تے۔ پروٹا پڑھتے تھے۔ اور جی چاہتا تھا کہ کسی طرح آج ہی کتتاب ہاتھ میں  
 آجائے۔ خدا خدا کر کے کتتاب تیار ہوئی۔ اور اب نسیم صاحب نے  
 کہا کہ پہلو اس کتاب کو لے کر غنی تال دہلی اور لاہور وغیرہ کا سفر کر آئیں۔ یہ پہلا  
 ہم لوگ بھوائی ضلع غنی تال پونچھ۔ جہاں براہِ محترم ڈاکٹر محمد زبیر صاحب اس وقت  
 ملازم نہ تھے۔ بلکہ دق کے مریض کی حیثیت سے مقیم تھے۔ اور اب دق کے مریضوں  
 کے اسی سسٹی ٹوریم میں علاج ہیں۔ بھوائی میں موج تبسم کی کافی اشتاعت

ہوئی۔ جتنے خریدار اس چھوٹی سی جگہ میں ہم کو ملے۔ ہم اس کو بہت سمجھتے تھے، بھوالی  
 سے پیدل ہی مٹی تال کا سفر کیا۔ اور اس سفر میں نسیم صاحبہ اس قدر خستہ  
 و خراب ہوئے کہ ان کو واپسی میں اپنے متعلق یہ شبہ ہو گیا تھا کہ شاید کچھ  
 چھوٹا ہو گیا ہے یعنی پیر کچھ گھس گئے ہیں۔ بھوالی اور مٹی تال کے اس سفر کے  
 بعد ہم دونوں دہلی پہنچے۔ اور تاج محل نامی ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ اسی دن  
 احباب سے ملے۔ اور اکبر حیدری مرحوم نے ہم دونوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ اسی  
 دن نیرنگ خیال کے ایڈیٹر حکیم یوسف حسن صاحب اور اسسٹنٹ ایڈیٹر  
 صلیف ہاشمی مرحوم ان کے یہاں مدعو تھے۔ کھانے پر برادرم عشرت رحمانی  
 صاحب بھی تھے۔ باتوں ہی باتوں میں نسیم انہو نوی میں اور حکیم یوسف حسن صاحب  
 میں کچھ بڑی اور پنجاب کی بحث چھیڑ گئی جس نے اہانت ناگوار طویل کھینچ لیا۔ اور آخر  
 ہم کو اور اکبر حیدری مرحوم کو اس بحث میں پڑ کر اسے ختم کرنا پڑا۔ مگر نسیم اس قدر  
 ناراض ہوئے کہ پنجاب جانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ ہم لوگ صبح ہوٹل میں بیٹھے  
 ہی تھے کہ ایک صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ ”آپانے یہ پرچہ دیا ہے اور  
 جواب مانگا ہے“ یہ پرچہ وہاں کے ایک زمانہ رسالہ کی ایڈیٹر صاحبہ کی طرف  
 سے تھا جنہوں نے ہم کو اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ پہنچے اور  
 گودہ خود پردہ میں رہیں مگر ان سے کافی تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ آخر جب ہم واپس  
 آنے لگے تو ہم سے رسالہ کے لئے ایک مضمون کا وعدہ کیا گیا۔ جسے ہم نے ہوٹل پہنچ  
 کر رات ہی میں ختم کر دیا۔ اس لئے کہ ایک خاتون کا مطالبہ تھا اور صبح وہ مضمون ان  
 پہنچوا دیا۔ دہلی کے اس سفر میں ”موج تبسم“ اور ”حسبیم“ کے لئے کافی کامیاب لوگوں

نے کیا۔ اور خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔

## اختیار سرچ کا احراز

نسیم صاحب رسالہ انکشاف سے علیحدہ ہو کر ایک زمانہ رسالہ حریم کے نام سے نکال رہے تھے۔ جواب تک نکل رہا ہے۔ اس رسالہ کے عملہ ادارت میں شوکت ولہن کا نام بھی تھا۔ اور رسالہ میں ہم برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ نسیم صاحب سے جو تعلق تھا اس کا علم ہو چکے تھے، وہ کسی طرح برا دورانہ تعلقات سے کم نہ تھے۔ بلکہ بھائی توخیر یوسف کے بھی تھے۔ مگر نسیم ایسے دوست کم ہوتے ہیں۔ اب گویا ہمارے دوستوں میں ایجن سلوٹوسی اور نسیم انہو فوسی تھا۔ ویسے تھے جن پر ہر طرح پورا ہوتا ہو سکتا تھا۔ ہم لوگ زیادہ سے زیادہ ساتھ رہتے تھے۔ اور ہر منہ کھاتے ہیں تینوں، باپ بیٹا روح القدس کی طرح ساتھ ساتھ شریک کرتے ایک دن ہم تینوں نے مشورہ کیا کہ کیوں نہ ایک ہفتہ وار خالص مزاحیہ اخبار نکالا جائے، نسیم صاحب نے فوراً اپنے چہرہ پر ستارنی تھیر کے اشارہ پر اٹھ کر اٹھنا چاہے تھیں پھلا کر اپنے رسالہ نظر کے تجربہ کو اجاگر کرنا چاہا اور اتنی دیر میں ہم نے اخبار کا نام سرچ تجویز کر دیا۔ اور تھوڑی دیر میں امین بیٹا پارک کے سبزہ زار پر بیٹھے ہی بیٹھے پوری اسکیم تیار ہو گئی لیجئے ہدی تین دن کے اندر ڈیکلرشن داخل کر دیا گیا اور طے بہ پایا کہ ہم کو زرد کوٹھی سے اکٹھ کر امین آبادی کے کسی حصہ میں آجانا چاہئے اس لئے اتنی دور رہنا اودھ اخبار کی ملازمت کرنا۔ اور پھر سرچ کی ادارت کرنا۔ سب آسان نہ رہے گا؟ رائے معقول تھی لہذا ہم نے والد صاحب سے اجازت

لی۔ بیوی کی انگلی پکڑی۔ ایک بچہ یعنی سپاں سعید عمر کو بھی جو ابھی چاند  
 ماہ کے تھے۔ ساتھ لیا اور لاٹوش روڈ کے ایک مکان میں آگئے۔ جو اندر سے  
 ہمارا مکان تھا۔ اور باہر سے اخبار سرچ کا دفتر۔ اب بیگم صاحبہ کے سر بھی گھراؤ  
 اپڑی تھی۔ ہم نے آج تک سب کچھ کیا تھا۔ لیکن نوں تیل۔ لکڑی کی فکر بھی  
 نہیں تھی۔ اور اب ڈیپریٹاں تھیں۔ کہ کیا کریں گے۔ مگر خدا بھلا کرے پاری پوری  
 کا۔ اس نے ہم کو اس فکر میں آج تک مبتلا نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ ہم کو یہ کبھی  
 معلوم نہ ہو سکا کہ آٹے کا کیا بھاڑ ہے۔ لکڑی کس حساب سے آتی ہے۔ گوشت  
 کتنے سیرتے۔ بیگم صاحبہ دھمکانی ضرور ہیں کہ یہ متب باتیں آپ کو انا چاہئیں۔ مگر یہ  
 وہاں عملی صورت سمجھی اختیار نہیں کرتی۔ اس ذرا سے مکان بدلنے ہی میں بدحواسی  
 کا عالم یہ تھا کہ گویا شہر کے ایک کدہ سے دوسرے محلہ میں جاتے ہیں بلکہ ولایت  
 کا سفر زینیں ہے۔ حالانکہ یہ کام سب دوسرے لوگوں نے کیا تھا اور ہم صرف  
 یہ کہہ کر چلے آئے تھے بیگم سے شام کو نئے گھر میں ملاقات ہوگی۔ مگر اللہ اکبر وہ  
 انتہام تھا۔ اور وہ ڈیرہ واری محسوس ہو رہی تھی کہ گویا نہ جانے کتنی بڑی اسمبلیت  
 پڑ گئی ہے۔ گھر کا تمام انتظام بیگم نے درست کر لیا۔ اور دسمبر ۱۹۳۱ء میں ہم نے  
 آریاب ثلاثہ کا اخبار سرچ نہایت شاندار طریقہ پر بہت ہی خوبصورت سرورق  
 کے ساتھ نکالا۔ پرچہ دو قسم کا چھایا گیا۔ ایک عام ایڈیشن، غریبامیو، اور دوسرا  
 ایڈیشن، امیرامیو۔ یہ ان دونوں ایڈیشنوں کے نام تھے۔ غریبامیو تو دس روپے بنا ہوا تھا  
 مگر امیرامیو سرچ کی ایجاد تھی، جو آج تک قائم ہے۔ سرورق پر ایڈیشن کی بنیاد تھی  
 ہمارا نام تھا۔ اسٹنڈرڈ ایڈیشن، سلو نوئی، اور مینجنگ پر دپرائسٹنسیم انہو نوئی، پرا

ہم پرچہ بازار میں آیا تھا کہ لوگوں کو دوسرے اور پھر تیسرے اور آخر ہر نمبر کا مسلسل انتظار رہنے لگا۔ نئے نئے کالم اس میں جاری کئے۔ تمام اطراف ملک کے مزاح نگاروں سے بہتر سے بہتر مضامین لکھوائے۔ نئے نئے مزاح نگار پیدا کئے۔ اور کچھ سی دنوں میں سر پہنچنے لگا۔ اپنا ایک خاص حلقہ بنا لیا۔ اور خریداروں کی تعداد میں دن درگنی رہا۔ جو گنی ترقی ہوتی گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس اخبار کی ایک خاص وقعت اخباری برادری میں بھی قائم ہو گئی۔ اس کے مضامین معاصرین نے نقل کرنا شروع کر دیئے۔ اور اس کے تبصروں سے بڑے بڑے سوراچو کئے رہنے لگے۔ کہ معلوم نہیں کب کس کی کس رنگ میں خبر لے لی جائے۔

## خوشید عمر

سعید عمر بڑا بچہ پونے دو سال کا تھا کہ دوسرے صاحب خوشید عمر تشریف لے آئے۔ سعید کا رنگ سا نوا لہا تھا۔ مگر یہ بچہ نہایت سرخ و سپید پیدا ہوا۔ بلکہ جب بیری ہوئے تو انوار شد صاحبہ اس کو لے کر چبے دکھانے لائیں۔ تو میں سمجھا یہ مجھ سے مذاق ہو رہا ہے۔ کسی اور کا بچہ لے کر آگئی ہیں۔ بھلا میرے یہاں ایسا حسین بچہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ مگر بعد میں اس بچے نے اور بھی باتیں پیر نہ کئے۔ خوب موٹا تارہ اور نہایت شگفتہ ہو گیا۔ مگر میں سعید کو زیادہ چاہتا تھا۔ اور میرے دل میں خیال پیدا ہو گیا تھا کہ سعید کی دل شکنی ہوگی۔ اگر اس کے ساتھ کسی کو بچا لیا جائے گا۔ بلکہ جب بڑا ہو جائے گا تو ممکن ہے کہ اس کو یہ خیال بھی آنے لگے۔ کہ خوشید کو اس لئے چاہا جاتا ہے کہ وہ خوبصورت ہے۔ میں اپنے سانپ لے سعید کو بد دل کرنا نہ چاہتا تھا۔ مگر یہ



حضرت غورخو رشید خود ہی مجھ سے بہت زیادہ پٹنے لگے۔ اور آخر رفتہ رفتہ ذہنیت یہاں تک پہنچی کہ کسی وقت وہ مجھ سے علیحدہ ہی نہ ہونا چاہتے تھے۔ اب بھی سعید اور غورخو رشید میں رنگ کا وہی فرق موجود ہے۔ مگر سعید نہایت متین اور سنجیدہ ہی اور غورخو رشید نہایت طرار اور بزدل سنج سعید کو پڑھنے کا زیادہ شوق ہے۔ اور غورخو رشید عام دھچپیوں میں اپنے کو ہمیشہ مصروف رکھتے ہیں۔

## ایک مشاعرے کی صدارت

جھانسی میں ایک مشاعرہ بہت بڑے پیمانہ پر منعقد کیا گیا۔ اور اس کی صدارت کے لئے ہم کو وہاں سے طلب کیا گیا۔ اب ہمیں یہ فکر کہ یا اللہ یہ صدارت کیونکر ہو سکے گی۔ ہم سے۔ غزل پڑھ دینا دوسری بات ہے حلقہ احباب میں چہک لینا دوسری چیز ہے۔ مگر مشاعرہ کا خطبہ صدارت کیسے پڑھیں گے معلوم نہیں کتنا مجمع ہو۔ کیسے کیسے شاعروں۔ انتظام تو بڑے پیمانہ پر نظر آتے ہیں۔ شاندار بات تو یہ ہے کہ نہ باقی کچھ اس طرح بول دیں کہ لوگوں کو یہ خیال گزرے کہ جہتہ کچھ دیا ہے مگر یہاں اس کی عادت ہی نہ تھی۔ آخر طے کیا۔ کہ خطبہ صدارت تو لکھا ہوا ہوتا ہی ہے لکھ کر کیوں نہ لے جائیں۔ چنانچہ ایک خطبہ لکھا اور پڑھنے کے کئی رہبر سل کئے اور آخر مقررہ تانت پر پہنچنے کے لئے جھانسی روانہ ہو گئے۔ خیال تھا کہ جھانسی کے اسٹیشن پر لوگ لینے آئیں گے۔ لہذا ہم پہلے ہی سے بنے سلوٹس کچھ صدر منتخب بنے ہوئے پلیٹ فارم پر اترے۔ مشاعرے کے کچھ رفاکار ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ ہر ڈبہ میں جھانک رہے تھے۔ مگر ہم سے کوئی بات بھی نہ پوچھتا تھا۔ آخر بڑی دیر کے بعد ایک

رضا کار صاحب نے ہمارے پاس آکر دریافت کیا۔

”کیا آپ لکھنؤ سے تشریف لائے ہیں“

عرض کیا ”جی ہاں“

فرمایا ”اس ٹرین سے شوکت تھانوی صاحب تشریف لانے والے تھے

ان کو تو آپ نے نہیں دیکھا“

عرض کیا ”میں ان ہی کالڈ کا ہوں۔ والد صاحب تشریف لانے کے لئے بالکل

تیار تھے۔ کہ کل صبح ہی فالج کا ہنایت سخت حملہ ہوا اور آخر مجھ کو حکم دیا کہ تم میرا

خطبہ صدارت لے کر چلے جاؤ“

سب رضا کار اس وقت ہمارے گرد جمع ہو چکے تھے۔ اور اس حادثہ کا سب

ہی کو افسوس تھا۔ مجبوراً شوکت تھانوی صاحب کے بجائے ان کے صاحبزادے

کو لے کر سب چلے۔ کہ اتنے میں برادرِ محترم صاحب شاہ جہاں پوری ”شوکت

بھائی“ شوکت بھائی پیچھے دوڑے ہوئے آئے، اور ہم سے بغلیں ہو گئے۔ ہم نے

ان کو یہ لطیفہ سنا کر کہا کہ یہ عجیب ہے اس ٹرین پر شوکت تھانوی کی مناسبت سے

مولانا شوکت علی کی قسم کا ایک بھاری بھر کم کوئی شوکت تھانوی تلاش کر رہے

ہیں۔ اگر میں ان سے کہتا کہ میں ہی شوکت تھانوی ہوں تو ان کو ہرگز یقین نہ

آتا یا اگر یقین آتا تو یہ بیچارے ہوتے۔ شوکت تھانوی پر فالج کے حملہ سے

بھی زیادہ مایوس۔ آپ کو چاہئے تھا کہ اتنا بڑا مشاعرہ کیا تھا تو اتنا ہی بڑا

صدر بھی چنا ہوتا۔ ایک سو کھاسہا فاقہ زدہ صدر چن کر آپ نے یہ لطیفہ پیدا

کیا ہے۔ اس قصہ کا مشاعرے کے آخر تک چار ہا مشاعرے میں سمجھ نہ پوچھئے کہ

خطبہ صدارت کس طرح پڑھا ہے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ خود اپنی پیمانی کا حکم خود اپنے کو سناتا ہے۔ ایک توجہ جھانسی کی گرمی اس پر نیا نو بیلا صدر تمام جسم سے پسینہ کا ایک دریا رواں تھا۔ شروع شروع میں کاغذ کے حرور بھی نظر نہ آتے تھے دو نو پیرا تروکھی اور دونوں ہاتھ پر رب کچیم کا نپا رہے تھے۔ اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ پہلے تو خیر لطیف کے طور پر فاج گرا تھا۔ مگر اس وقت ہم خود فاج بن کر گئے ہی والے ہیں۔ کسی کے اوپر مگر حاضرین نے ایک اوجھ نعرے پر تالیاں بجائیں۔ اور ایک اوجھ جگ لوگ ہنسنے تو یہ ارتعاش ختم ہوا اور آخر خطبہ صدارت جو ہم نے اپنی عقلی سے نہ جانے کیوں ذرا طویل لکھ لیا تھا۔ ختم ہو گیا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر ہم کو یہ معلوم ہوتا کہ صدارت کا اعزاز ہمارے لئے اس قدر گراں ثابت ہو گا۔ اور ہماری جان پر اس طرح بن جائے گی۔ تو دور ہی سے سات سلام کرتے۔ اور بانیان مشاعرہ سے کہہ دیتے کہ ہماری مصروفیات ہم کو اجازت نہیں دیتیں کہ ہم مقررہ تاریخ پر آپ کے مشاعرے کی صدارت کریں یہ طریقہ بھی حکما نے بڑا آدمی بننے کے لئے مجرب بتایا ہے۔

## شیخ احمد خاں

ان حضرات کو اکثر شعاعروں میں صفت سادہ عین کی نسبت بنی ہم پہلی ہی دیکھ چکے تھے اس کے علاوہ امتین سادہ نوی صاحب کے رسالہ نظر کے ایڈیٹر ریل پور میں آپ کا نام نامی اسم گرامی تھا۔ مگر اب تک آپ سے براہ راست ملاقات نہ تھی اتفاق سے اسی زمانہ میں لکھنؤ کے ایک مشاعرے سے جو بلا وجہ خول پہنچا ہوا تھا

دو تین آدمی چپکے سے گزار ہوئے ان میں ایک یہ خاکسار اور دوسرے رفیع احمد خاں صاحب تھے۔ ہم چپکے سے بھاگے تھے۔ اس کی توجہ یہ تھی کہ ہم غزل پڑھ چکے تھے اور اتفاقاً اب آخر شاعر تک ہم کو ٹھہر کر دوسروں کا کلام سنا چاہتے تھے۔ مگر ہم حیران تھے کہ یہ حضرت توفیق صاحب تھے۔ یہ اس قدر کیوں چھپ کر جا رہے ہیں پوچھا تو معلوم ہوا کہ آپ کو ایک شاعر صاحب پیدا ہوا کر کے لائے تھے اور ظاہر ہے کہ ان کا مقصد یہ ہو گا کہ خان صاحب ان کی شاعرے کی سرخروئی دیکھیں اور غزلیں سن کر داد دیں۔ مگر چونکہ ان کے پڑھنے میں کافی دیر تھی لہذا آپ ان سے آنکھ بچا کر فرار ہوئے ہیں۔ ہم دونوں کو اب یہ فکر تھی کہ کسی طرح کوئی سوار مل جائے تو گھر تک پہنچ جائیں۔ اس شاعرے کی صدارت متین الدین صاحب ایڈووکیٹ مرحوم کر رہے تھے۔ ایک ایک خان صاحب نے دیکھا۔ ان کا کار خاں ان کو واپس لے جانے کے لئے آ رہا تھا۔ بیچ سڑک پر دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ ڈرائیور نے کار روک لیا۔ تو آپ نے پوچھا متین صاحب کی گاڑی ہے نا۔ اس نے کہا جی ہاں۔ کہنے لگے "فوراً چلو امین آباد" اور ہم نے کہا "متین صاحب نے اندازہ تو بالکل ٹھیک لگایا تھا کہ راستہ میں گاڑی مل جائے گی۔" ڈرائیور نے اب کوئی بھی سوال نہ کیا۔ اور ہم دونوں کو کار میں بٹھا کر امین آباد لے آیا۔ خان صاحب معلوم نہیں کیا کہنے والے تھے۔ کہ ہم نے ڈرائیور سے کہا "اچھا اب ہاؤز اور کہہ دینا کہ وہاں بند تھی۔ ڈرائیور بے چارہ چپکا چلا گیا تو خان صاحب نے ہلسی سے بے قرار ہو کر کہا "یہ ٹکڑا قسم خدا کی حاصل شاعر ہے۔ کہہ دینا وہاں بند تھی۔" اس وقت چار بجے رات کو وہاں کے

نیکی تک وہ لا جواب رہی ہے۔ کہ متین صاحب بھی واوئیے بغیر نہیں رو سکتے۔  
 اس ملاقات کے بعد سے اور اس مشترکہ شراکت کے بعد ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ  
 ہم دونوں کی زندگی علیحدہ علیحدہ نہایت قطعاً بھل ہے اور اس وقت تک  
 کوئی مفہوم ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک یہ دونوں مصرعے ساتھ پیش نہ ہوں  
 پھر خانہ صاحب نے اپنی کسی دیکھپی میں ہم کو اور ہم نے کسی سرگرمی میں خانہ صاحب  
 کو کبھی ذرا موش نہیں کیا۔ ہر چند کہ خانہ صاحب کے مشاغل کچھ ایسے بھی تھے جن سے  
 ہم کو کوئی دیکھپی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ مگر خانہ صاحب چاہتے تھے کہ ان کے وہ مشاغل  
 بھی ترک نہ ہوں اور ہم بھی ان کے ساتھ رہیں۔ ہم نے اب تک اتنا نہیں  
 اتنا برحسبہ اور ایسا قابل قدر آدمی نہیں دیکھا تھا۔ قابلیت سے خان صاحب  
 نے کبھی کوئی قلم نہ خود تو نہیں اٹھایا۔ مگر ان کی قابلیت سے دوسرے ہمیشہ فائدہ  
 اٹھا لیتے تھے۔ آپ کے عجیب و غریب مشاغل تھے۔ مثلاً آندھی آئے یا پانی  
 برسے۔ طوفان آئے یا قیامت برپا ہو جائے۔ آپ کے لئے شام کے وقت  
 چوک جانا۔ دفتر کی ماضی سے کسی طرح کم ضروری نہ تھا۔ اور تقاضا یہ کہ  
 تم بھی چلو۔ ہم اس کو چہ سے بالکل واقف نہ تھے۔ ایک وحشت سی ہوشیہ ہوتی  
 تھی۔ مگر رفیع احمد خاں کی جادوگری میں بھی بنگال کی جادوگریوں سے کچھ کم کمال  
 نہ تھا۔ وہ کسی زمانہ میں آدمی کو بیل بنا کر کھونٹے سے باندھ دیا کرتی تھیں۔ خانہ صاحب  
 نے اپنے جادو کے زور سے ہم کو بھی اپنی قسم کا جادو بنا کر رکھ دیا تھا۔ اور ہم ان کے  
 ساتھ بلاتا غنہ چوک جانے لگے تھے۔ بغیر کسی دیکھپی کے، ان کو چوک کی خلوت سے دیکھپی  
 تھی اور ہم کو ان سے، ان کی ذہانت سے اور ان کی باغ و بہارانت و طبیعت سے

ان کے چوک کے دوستوں کا ملقمہ ہوا دوسرا تھا اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ خان صاحب  
کے ان سے بڑھ کر دوست اور کہیں نہیں ہیں۔ جس کو دیکھتے خان صاحب سے واقف  
جس کو دیکھتے وہ خان صاحب کو گھیرے ہونے اور سب کو تیرت کہ خان صاحب  
کے ساتھ یہ نیا جاتو رکون سا ہے۔

## ایک شدید امتحان

رفیع احمد خاں صاحب کو ایک مندر یہ تھی کہ ان کے دوستوں میں یہ دعویٰ کوئی  
کیوں کر ہے کہ میں بڑا پارسا ہوں وہ اس کبڑی بڑھیا کے ماتہ تھے۔ جو دھاگری تھی کہ  
خدا کرے ساری دنیا بڑی ہو جائے۔ چنانچہ رفیع احمد خاں صاحب نے ہم کو بھی ایک  
ایسے بالا خانہ پر پہنچا دیا۔ جہاں ایک نہایت ہی معقول تنہ کی صاحبزادی  
اپنی بڑی بہن کے ساتھ رہتی تھیں۔ خان صاحب کی بڑی آؤ بھگت ہوئی  
اور معلوم یہ ہوا کہ آپ کے لئے یہ جگہ نئی نہیں ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ خاں صاحب  
کسی جگہ کو اپنے لئے نہ رہنے دیتے تھے چوری تو خیر صرف ایک ہی جگہ کہتے  
تھے مگر ہسپتال پیری کے لئے تمام چوک پڑا ہوا تھا بہر صورت اس جگہ ہم  
خان صاحب کے ساتھ پہلی مرتبہ آئے تھے۔ اور اصرار دھڑکی باتوں کے بعد  
خاں صاحب نے کیرم بورڈ اپنی طرف گھسیٹ کر ایک باندی کھیلنے کا فیصلہ  
کر لیا۔ بڑی بہن اور خان صاحب پارٹر ہو گئے۔ ہم اور چھوٹی بہن پارٹر بنے  
ان سب میں سب سے بچو کیرم ہم کھیلتے تھے۔ اس لئے کہ مشتی بڑھی ہوئی تھی اور  
آٹھ کل گھر پر روزانہ کیرم ہوا کرتا تھا۔ اب چھوٹی بہن نے کھیل کے خوش میں شاباش

ہے۔ پارٹنر کیا کہنا ہے پارٹنر وغیرہ کہہ کر براہ راست ہم کو مخاطب کرنا شروع  
 کر دیا۔ اور آخر میں جب ہم بیت گئے تو بھی یہی کہہا۔ اب جس کا جی چاہے ہم سے  
 کوئی بڑی سے بڑی شرط لگا کر کھیل لے۔ خان صاحب نے دوسرے دن  
 کے لئے باقاعدہ میچ طے کر لیا۔ اور کچھ مشائی وغیرہ کی شرط بھی ہو گئی۔ اسی طرح  
 اب روز میچ ہونے لگے۔ اور روز ہم کو حستان صاحب کے ساتھ وہاں جانا  
 پڑا۔ ہمارے اور خان صاحب کے علاوہ مرزا صاحب بھی جاتے تھے۔ جن کا  
 پورا نام اس موقع پر اس لئے لکھنا مناسب نہیں ہے کہ ممکن ہے مرزا صاحب  
 اس کو اپنے لئے مناسب نہ سمجھیں۔ ہمارا کیا ہے ہم تو ادکھلی میں سر ڈال ہی  
 چسکے ہیں۔ اس روز کے پھیروں کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ ہماری پارٹنر نے  
 رنگ لانا شروع کر دیئے۔ کچھ عجیب رنگاؤٹ کی باتیں عجیب عجیب مطالبات  
 مثلاً یہ کہ ہم مرزا صاحب اور خان صاحب کے ساتھ آنے کی بجائے تنہا بھی آیا کریں  
 ہم اگر کسی روز ننگے تو دوسرے دن خان صاحب نے ان کی شکایت  
 ہم تک پہنچا دی اور اب ہم پر زور دیا جا رہا ہے کہ چلو میں ان سے وعدہ  
 کر کے آیا ہوں۔ کہ کل ضرور تھا اسے پارٹنر کو لے کر آؤں گا۔ ہم اس خطرہ سے  
 آگاہ ہو چکے تھے۔ اور اب ہم رسیاں توڑا رہے تھے۔ اور خان صاحب  
 ہماری اس کیفیت سے مایوس ہوتے جاتے تھے۔ مرزا صاحب ادھر کے پیغامات  
 لاتے تھے۔ اور عجیب عجیب باتیں روز آکر سنایا کرتے تھے۔ کہ بھی تم کیوں اس کی  
 جان کے پیچھے پڑے ہو۔ کل بھی جب ہم لوگوں کے ساتھ تم کو اس نے نہ دیکھا  
 تو بیجاری کے آسنو نکل پڑے۔ حد یہ ہے کہ اس کی بڑی سن تک کہ چکی ہے کہ



یہ ایسی ہی بے قرار ہے تو اپنی ذمہ داری خود ہے۔ اور وہ اگر کسی تھوڑی سی بات کے ماتحت  
 یا کسی اقتصادی مشکل کی وجہ سے نہیں آتے تو ان سے کہہ دیجئے کہ شوق سے آئیں  
 روپیہ میسے کا کوئی سوال نہ ہو گا۔ مگر ہم نے نہ تو خان صاحب کا اس سلسلہ میں کہنا  
 سنا اور نہ مرزا صاحب کی کوئی بات مانی۔ خدا کو بچانا تھا، اس نے ہم کو بچا لیا  
 اور ہم اس امتحان میں بے غلبہ کامیاب رہے۔

## بکرے کی مال کب تک خیر منائیگی

اس امتحان میں تو کامیاب ہو گئے، مگر ایک دوسرا امتحان سر پر آگیا یعنی  
 وہی صاحب جو دہلی میں ہم کو دعوت دے چکے تھے، لکھنؤ شریف لاکر ایک سرائے میں ٹھہر  
 گئیں۔ اب ہم نے یہ سوچا کہ ایک شریف گھرانے کی خاتون کا اس طرح ہمارے  
 شہر میں آکر ایک سرائے میں ٹھہرنا کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا چنانچہ  
 ہم نے ان کے بھائی صاحب سے کہا، آپ اپنی ہمیشہ کو یہاں لے آئیے  
 میں اپنی بیوی سے ان کو ملا دوں گا۔ اور وہ یہاں آرام سے رہ سکیں گی۔ تو وہی  
 ہی دیر میں وہ ہمارے یہاں آ گئیں۔ چونکہ پردہ کرتی تھیں، لہذا ہم نے اپنی بیوی سے  
 کہہ دیا کہ آپ ان کو آرام پہنچانے کی پوری کوشش کیجئے۔ ان کے بھائی صاحب کی  
 ملاقات میں کروں گا۔ اب وہ ہمارے یہاں وہاں ہو گئیں، ایک ہفتہ، دو ہفتے  
 تین ہفتے، ایک مہینہ، دو مہینے، تین مہینے، اور ایک دن یہ کہہ کر کہ جب میں بھائی  
 صاحب کو ہستی ہوں تو پردہ کیسا۔ سنائے آگئیں نہایت حسین و جمیل ہفت  
 نمب سردار اور نہایت خوش مذاق ہم پر یا بیوی پر ان کا اس قدر رحم کرنا

ہرگز بار نہ تھا۔ مگر بیوی غریب گرفتار ہو کر رہ گئی تھی۔ نہ کہیں آسکے نہ جاسکے وہاں  
کو گھر پر کیسے چھوڑ دیا جائے۔ آخر ایک ضرورت سے ان کو والد صاحب کے پاس  
زرد کوٹھی جانا پڑا۔ گرم بھی ان کے ساتھ گئے۔ اور ان محترمہ کے سپرد گھر کی جوابدہی  
کر دی گئیں۔ کیجئے آپ جانیں آپ کا کام جاسنے۔ رات کو تو غیر زرد کوٹھی میں  
بیوی کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ مگر دن کو سر پہنچ کے دھتور کی وجہ سے اس گھر میں  
بھی آنا پڑتا تھا۔ اور یہی آنا جانا آخر ایک دن ہم کو لے ڈوبا اور میرے پسندیدہ  
نظر میں۔ اور میرے ان نظروں کی پذیرائی، شیطان نے ہم دونوں کو اپنی آغوش  
میں لے کر اس قدر پھینپا کہ دونوں ایک ہو گئے۔

## احساس شکست

ہم ڈر بہ چکے تھے۔ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ مگر اس گناہ کے بعد ہی آنکھیں  
گھٹ گئیں۔ سب سے پہلے اپنی اس معصوم بیوی کا خیال آیا جس کی ہم نے خیانت  
کی تھی اور جو ہم پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتی تھی جس نے آج تک کبھی ہم پر شک  
نہ کیا تھا۔ اور جس کے اعتماد کو آج ہم نے اس بری طرح پامال کیا تھا۔ گناہ کی لذت  
کے بعد احساس گناہ کی بے کہنی ہم کو مارے ڈالتی تھی۔ اور ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ  
ہم کس طرح اس بوجھ سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ آخر ہم نے ایک قطعی فیصلہ کیا  
اس فیصلہ پر غور کیا۔ اور نتائج سے قطعاً بے فکر ہو کر ہم نے ایک اقرار کریم کی  
طرح اپنے کو بیوی کے سامنے پیش کر دیا۔ بیوی کے پاس پہنچ کر ہم اس قدر روئے  
کودہ بے پجاری تھی پریشان ہو گئی اور رورور کر ہم نے تمام قصہ من و عنان بیان کر دیا اور

کہ اس غریب کے دل کو دھچکا لگا ہو گا۔ مگر اس نے ہم کو مطمئن کرتے ہوئے کہا کہ آپ یقین کیجئے کہ آپ کی جو قدر و منزلت میری نظروں میں اب تک تھی آج اس سے دو بالا ہو گئی۔ آپ نے گناہ ضرور کیا ہے۔ مگر جس طے سے آپ اپنے اس گناہ کا اعتراف اور اقبال کر لیتے ہیں اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اب تک آپ میں وہ تمام معصومیت موجود ہے۔ جو اس قسم کا گناہ کرنے کے بعد پاش پاش ہو جانا چاہئے تھی۔ بیوی سے بہانہ کر چکنے کے بعد اور اپنے گناہ کی تھوڑی بہت سنرا خود اپنے کو دے کر ہم مطمئن ہو گئے۔ ہم ان صاحبہ کا نام بگھنے کا حق اب بھی نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ حالات ہم اپنے نگہ سے ہیں۔ ان کو بے نقاب کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ وہ اب نہایت خوشگوار زندگی بسر کر رہی ہوں گی۔ ہم ان کے بچوں کو بس کاٹنے کو نا نہیں چاہتے۔

## تاش اور بازیاں

رفیع احمد خاں صاحب کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ تاش کھیلنا بھی تھا۔ وہ روپے ڈکاکر تاش کھیلا کرتے تھے۔ کبھی فلش کبھی بینک کبھی رنپ یعنی کٹی اور آخر میں رمی۔ ہم تاشوں کے کھیل میں اب تک سوالیے غلام چور کے کوئی کھیل کے نہ جانتے تھے۔ چانس بھی آتی تھی۔ مگر بھول سے گئے تھے۔ مگر چونکہ خاں صاحب کا ہر وقت کا ساتھ تھا۔ لہذا وہ کھیلا کرتے تھے اور ہم بیٹھے دیکھا کرتے تھے۔ ہم سے جب کبھی کھیلنے کے لئے کہا ہم نے ہمیشہ یہی کہا کہ بخشے۔ اس قاکسار کو۔ مگر رفتہ رفتہ کھیل اس قدر سمجھ گئے تھے کہ کھیلنے میں ان کو مشورہ دینے لگے کہ

کہ یہ پتا نہیں۔ یہ پتا پھینکو اور ایک چال نہیں، درچالیں چلو وغیرہ یہاں تک کہ ایک دن خاں صاحب ہم کو کٹی تاش کھلانے میں کامیاب ہو گئے۔ قاعدہ ہے کہ نیا جواہری ہمیشہ جیتا کرتا ہے۔ چنانچہ پہلے ہی دن دُروپے کا سر باہ لگا کر ہم نے جو بیس روپے جیتے۔ اب کیا تھا۔ چسکا پڑ گیا۔ روز خان صاحب کے یہاں پہنچے۔ ہے ہیں۔ اور روز کھیل رہے ہیں۔ شروع شروع میں خوب جیتے اور یہ یقین۔ ہو گیا کہ ہم تاشوں کے معاملہ میں نہایت خوش قسمت ہیں مگر جب عسادت اچھی طرح پڑھ چکی تو اب ہمارے شروع ہوئی۔ اور ہمارے بھی ایسا کہ طبیعت ہر ہی ہو گئی۔ محدود آمدنی اور یہ شوق، نتیجہ یہ کہ ادھر ادھر سے قرض لینا شروع کر دیا اور ایک مرتبہ تو پوری تنخواہ ہمارے جانے کے بعد مجبوراً ہم کو نسیم انہونی سے کہنا پڑا کہ ہم کو جس طرح بھی ہو سکے کسی سے تنخواہ کے برابر ایک رقم قرض دلو اور ہم تھوڑی تھوڑی کر کے ادا کر دیں گے۔ نسیم بچا ہے کے پاس خود روپیہ موجود نہ تھا لہذا ایک سو دو سو اعلیٰ سے پر دو ٹ پر روپیہ قرض لے کر بیوی کو جا کر تنخواہ دی تاکہ اس غریب کو پتہ نہ چلے کہ اس کے "معصوم" شوہر نے کیا حرکتیں شروع کر رکھی ہیں۔ درنہ اسے بہت امداد ہو گا۔ مگر اب ہر مہینے ہم صرف سو دیا کرتے تھے اصل دینے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ اس لئے کہ اصل کی ادائیگی کے لئے ہم کو کسی دن راجہ نل کی ہربانی کا انتظار تھا۔ مگر وہ ہارے والوں پر ورا کم ہی مہربان ہوتے ہیں۔ ہمارے جوئے روپے کو واپس لانے کا خیال اور بھی ہر اتا ہے۔ اور کھیل چھوڑنے نہیں دیتا یہ امید کہ کیا اب ہمیشہ ہمارے ہی جائیں گے۔ کھیل سے ہاتھ اٹھانے نہیں دیتی۔ نتیجہ یہ کہ سلسلہ در سلسلہ اور زنجیر در زنجیر قسم کا شعلہ بن جاتا ہے۔

## بیوی سے لڑائیاں

اس تاش کے مسئلہ میں آدھی آدھی رات تک اور کبھی کبھی ساری ساری رات مشغول رہنا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ کیسلنے بیٹھ گئے۔ پھر ہوش نہ رہتا تھا کہ وقت کتنا گزر گیا۔ کبھی رات کو دو بجے آئے اور بیوی سے کہہ دیا کہ ایک مشاعرے میں پکڑے گئے تھے۔ کبھی ایک بجے آئے اور کہہ دیا کہ ایک جلسہ میں جانا پڑ گیا تھا۔ کسی رات دو بجے آئے اور تھوڑے کا بہانہ کر دیا۔ مگر اب یہ روز کا مشغلہ تھا۔ اور روز نے سنا دے گا۔ وہ پیاری سمجھ دن تو یقین کرتی رہی مگر اس کے بعد ایک فکر یہ پیدا ہوئی کہ آخر ماہر کیا ہے۔ کبھی اس طرح غائب نہ رہتے تھے۔ اور اب تو کسی رات بھی صحیح وقت پر نہیں آتے۔ اگر کسی رات بارہ بجے آگئے تو گویا یہ سر شام آجانا سمجھا جاتا تھا۔ ایک مصیبت اور تھی کہ ہم تو خیر اس کا رخبرہ میں جاگتے تھے مگر بیوی کو اس وحشت میں نیند ہی نہ آتی تھی۔ ان کی ساری شگفتگی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کی شکوک نظر میں ہم پر پڑنے لگی تھیں۔ اور جاگتے جاگتے۔ اور ان ہی فکروں میں گھلتے گھلتے۔ وہ واقعی کچھ بیمار سی رہنے لگی تھیں۔ اور مزاج میں بھی چڑچڑاہٹ پیدا ہو گیا تھا۔ آخر اب وہ ہم سے لڑنے لگی۔ اور گھر پر ایک باقاعدہ مورچہ ہمارے خلاف قائم ہو گیا۔ ادھر سے جھوٹے اور ادھر سے سچے شکوے، احباب کے طعنے ہمارے گرد جمانے اور بری راہ پر پڑ جانے کے یقین کا اظہار۔ اپنی بے کسی اور بے بسی کا رونا۔ آنکھوں میں آنسو چہرے پر شوہر کی یونانی کا زہر کا غارہ، مختصر یہ کہ یہ سب کچھ تھا مگر خدا جانے یہ تاشوں کا بھوت کس قیامت کا تھا کہ ہم باوجود اتنی کوشش

کے سنبھلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ تاش کے ہر کھیل کے بعد توبہ کر کے اٹھتے تھے۔ مالی نقصان  
 بیوی سے خسرا ب تعلقات، اخلاقی خسارہ، اس سب پر اس وقت نظر  
 جاتی تھی۔ اور ہم گویا عہد کر لیتے تھے کہ اب کبھی تاش نہ کھیلیں گے۔ مگر دوسرے  
 ہی دن جہاں آفتاب غروب ہوا۔ راجہ نل نے کان پکڑے اور ہم کو وہیں پہنچا دیا  
 جہاں نہ جانے کا ہم فیصلہ کر چکے تھے۔ روز کا یہی قصہ تھا۔ روز توبہ اور روز شکست  
 توبہ۔ پھر مصیبت یہ تھی کہ خود ہم نے جاگ جاگ کر اور ہار ہار کر اپنا مزاج خراب  
 کر لیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ بیوی بیچاری پر غصے شروع کر دیئے۔ وہ تو ہمارے قصور پر ہم  
 سے خفا تھی۔ اور ہم اس بے گناہ سے اس طرح لڑتے تھے۔ گویا یہ آزادیاں  
 ہمارا حق تھیں۔ اور ان میں مداخلت کا اسے کوئی حق نہ تھا۔ میاں بیوی کے  
 درمیان ایک ایسی وسیع خلیج حائل ہو چکی تھی جس کے فاصلہ کا اندازہ تاش کے  
 باون بتوں کو برابر برابر رکھ کر لیجئے۔

## نماز بازی کے انکشاف

اسی زمانہ میں ہمارے داپنے کان کے نیچے ایک درم سا پیدا ہو گیا  
 جو کچھ ہی دنوں میں بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اس میں کوئی تکلیف نہ تھی۔ مگر درم  
 بڑھتا جاتا تھا۔ ڈاکٹروں کو دکھایا تو معلوم یہ ہوا کہ یہ دراصل کینسر مائے کامادہ ہے  
 اور اس کا ابھی علاج نہ ہو تو اس کے بڑھ جانے کا پورا خطرہ موجود ہے والد صاحب  
 یہ سن کر بے حد پریشان ہو گئے اور ہماری منہ بولی خالہ اماں بیگم صاحبہ قان بہادر  
 شیخ احمد علی صاحب نے کہا کہ میاں اس کا جم کر علاج کر لو اور اخسراجات کی

پر دانہ کر دے جو صرف ہو گا۔ میں دوں گی۔ ہم نے ان کو بتایا کہ ڈاکٹر بیس بائیس  
 انجکشن دگانے کو کہتے ہیں۔ اور ہر انجکشن پندرہ روپے کا ہو گا۔ خالہ اماں نے کہا تم  
 یہ انجکشن فوراً لگوالو۔ اور اس سلسلہ میں غفلت نہ برتو۔ چنانچہ اب ایک دن  
 بیچ کر کب پندرہ روپے کا انجکشن اس طرح لگئے دگا کہ ہم روپے لے کر جاتے تھے تاش  
 کی بازی میں لگا دیتے تھے۔ اور ہار کر یا کبھی کبھی جیت کر گھر آ جاتے تھے کچھ دن  
 تو ہر انجکشن کی قیمت ہم کو ملی۔ اس کے بعد پورے کورس کا روپیہ خالہ اماں نے  
 بچوا دیا۔ اور ہم نے نہایت رئیس بن کر اس زمانہ میں تاش کھیلنے اور کھیل ایک  
 انجکشن بھی نہ لیا۔ مگر یہ بھی حسد کی شان ہے۔ کہ وہ ورم رفتہ رفتہ ہو کر  
 بالکل خستہ ہو گیا۔ اور سب کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ کرامت ان  
 ہی انجکشنوں کی ہے۔

## تاش کا جواز

ہم دیکھتے تھے کہ تاش کے کھیل کو ہماری بیوی نہایت حقارت سے جوا کہا  
 کرتی ہیں۔ مہذب طبقہ کا ایک معمولی مشغلہ ہے۔ تمام تعلیم یافتہ اور بڑے بڑے  
 مشرعیات زائف اس کو بغیر کسی قسم کا کوئی عیب سمجھتے روزانہ کلب میں جاری  
 رکھتے ہیں۔ گھروں پر کھیلتے ہیں اور ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ ہم نے جو ایک دن  
 اپنے گھر پر احباب کو جمع کر کے تاش کھیل لے تو بیوی سے یہ بھی نہ دیکھا گیا اور ہم کو  
 جواہری کا نہایت تکلیف دہ خطاب دے دیا۔ ان کو دراصل اب تک اس کی  
 اطلاع نہ تھی کہ ہم روز اسی مشغلہ میں مصروف رہتے ہیں یہی ہے وہ مشاعرہ



یہ کہے۔ وہ جلدیہ اور یہی ہے۔ وہ تھیٹر جس میں ہم کو روز آدھی رات تک اور کبھی ساری ساری رات مصروف رہنا پڑتا ہے۔ ہم نے گھر پر استیلا تماش کھیلے تھے کہ اگر بیوی نے مناسب نہ سمجھا تو بجائے اس کے کہ ہم گھر سے غائب رہیں گھر پر سب کو جمع کر لیا کریں گے۔ مگر وہ تو تماشوں کا نام سن کر آگ بگولا ہو گئیں۔ اور اس قدر بیزاری کا اظہار کیا اور ایسا لڑیں کہ ہم نے آئندہ کئے گئے کان پکڑ لئے کہ اب کبھی گھر پر تماش نہ کھیلے گئے حالانکہ ہم نے انہیں بہت سمجھایا کہ تماش کے کھیل کو جو انہیں کہتے۔ تماشوں کے کھیل میں بازی لگا کر کھیلنا ہندو دنیا سائز قرار دے چلی ہے۔ بڑے بڑے وکیل اور پریسٹر جج اور دوسرے حکام سب ہی تماش کھیلتے ہیں۔ ہر کلب میں تماش ہوتا ہے۔ اور تماش کے کھیل کی مخالفت جہالت کی نشانی سمجھی جاتی ہے مگر وہ اس جہالت کے لئے تیار ہو گئیں۔ اور تماش کی مخالفت اور تماش سے نفرت میں کوئی فرق پیدا نہ کر سکیں۔ بلکہ ان کو اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ ہماری کم شد گیاں استیلا کے بدولت ہیں۔ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور دامن پھیلا پھیلا کر ہمارے دوستوں کو کوسا کرتی تھیں۔ اور ہم اس انتہا میں تھے کہ یہ ہم سے یوں ہو جائیں تو اچھا ہے مگر اکتہ رسی و منہ داری کہ ہر روز اسی دم خم سے رات کو دیر میں آنے سے بڑی تھیں آدھی رات کو گھر میں ایک ہنگامہ ہوتا تھا۔ نئے ہندو بیانات ہوتے تھے۔ تو بہ کی جاتی تھی۔ اور دوسری رات کو بھر دیا۔

### روزنامہ ہند

اخبار سترچ بھی نکل رہا تھا اور دواخبار میں ہم ملازم بھی تھے اور تماشوں

کی یہ قیامت خیز مصروفیت بھی تھی کہ اسی زمانہ میں روزنامہ تیج دہلی کے ایڈیٹر مسٹر اسلم  
 ورمانے لکھنؤ آکر ایک لمیٹڈ کمپنی قائم کر کے ایک باقاعدہ روزنامہ جاری کرنیکا فیصلہ  
 کر لیا پتا پتہ لکھنؤ میں اگر آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی بھی ہوئی۔ لمیٹڈ کمپنی قائم ہوئی  
 پریس خرید اگیا اور ہندو کے نام سے ایک روزنامہ جاری کرنے کے لئے ڈیکلریشن  
 داخل کر دیا گیا۔ ورما صاحب نے این سلوئی صاحب کی معرفت ہم کو اپنے اخبار کے  
 عملہ میں آجانے کی دعوت دی۔ تنخواہ اودھ اخبار سے زیادہ تھی۔ دوسرے اودھ  
 اخبار کی اس بے انسانی سے ہم بد دل بھی ہو چکے تھے۔ کہ سال بھر تک ہم سے باقاعدہ  
 ایڈیٹر کرائی۔ تنخواہ میں کوئی اضافہ یا قائم مقامی کا کوئی مزید الاؤنس بھی نہیں دیا  
 اور پھر ایک دوسرے ایڈیٹر کو بلا کر ہم کو ہمارے جگہ واپس کر دیا ان حالات کے تحت  
 ہم نے روزنامہ ہند کی اس دعوت کو منظور کر لیا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ ایک  
 ایڈیٹر شمس کا باقاعدہ اخبار ہوگا جس میں ذمہ دارانہ کام کرنے کا موقع ملے گا اور  
 کیا تعجب ہے کہ اسی پہانے ہم سے یہ تاشول والی بری عادت بھی چھوٹ جائے اور واقعی  
 نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ روزنامہ ہند میں اپنے کام کا چارج لینے کے بعد ہم بے حد مصروف  
 ہو گئے۔ ہم کو اخبار کا ناٹ ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ رات کو نو بجے دفتر جاتے تھے۔ اور صبح  
 چار بجے تک کام کرتے تھے۔ تمام رات تاروں کا سلسلہ قائم رہتا تھا اور ہم  
 اپنے اسٹاف کے ساتھ ان تاروں کے ترجمے کرتے۔ کاتبوں سے ان کو کھواتے اور  
 صبح چار بجے خبروں کی کاپی جڑوا کر پریس کے حوالے کر دیتے تھے۔ اور گھر آ جاتے  
 تھے۔ خبروں کے اس کام کے علاوہ شذرات اور مزاحیہ کالم بھی لکھنا پڑتا  
 تھا۔ اس کے لئے دن کو تھوڑی دیر کے لئے دفتر جانا پڑتا تھا۔ مگر یہ تھوڑی دیر اکثر

اس قدر دل کینچ جاتی تھی کہ چوبیس گھنٹہ کی سسٹل ڈیوٹی کی نوبت آ جاتی تھی مگر اب ہم کو اطمینان تھا۔ ایک تو یہ کہ تاشوں کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ دوسرے یہ کہ بیوی کو اب ہماری طرف سے یہ اطمینان پوچھتا تھا بلکہ اب ہم پر ترس آنے لگا تھا کہ کہیں اس قدر شدید محنت کا کوئی ناگوار اثر صحت پر نہ پڑ جائے۔ بتنا وقت تھا۔ وہ صرف دو کاموں میں مصروف ہوتا تھا۔ دفتر میں کام کرنا یا گھر پر سونا اخبار دانی بہت شاندار تھا۔ اور انتظامات اس قدر ٹھانڈے تھے کہ ہم کو اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی باقاعدہ اخبار میں کام کر رہے ہیں۔ اور اخبار نویسی جس کو کہتے ہیں۔ وہ دراصل اب شروع ہوئی ہے۔ رام لال صاحب درما کو ہم پر بے حد اعتماد تھا۔ اور وہ ہمارے کام سے نہایت خوش تھے۔ مگر ان میں تمام تمام خوبیوں کے باوجود بھی اسٹاف کے ایک صاحب نے ہمارے خلاف ان کے کان بھرنا شروع کر دیئے۔ اور ان کی رائے خراب ہونے لگی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کچھ سے رہنے لگے۔ مگر قبل اس کے کہ یہ اختلاف سامنے آئے رونا سہند کی زندگی کے دن پورے ہوتے نظر آئے۔ لمیٹڈ ملیننی تو تھی ہی۔ ساجھے کی ہانڈی اس کا چوراہے پر ٹوٹنا ضروری تھا۔ کچھ حصہ داروں نے وعدہ کرنے کے باوجود اپنے حصہ کی رقم نہیں دی۔ کچھ نے اخبار کی پالیسی میں مداخلت کرنا چاہی۔ مختصر یہ کہ تھوڑے دنوں میں ایسی گڑبڑ پیدا ہوئی کہ اخبار بند بخواہ غائب اور ہم پھر گھر پر۔

## پنجاب کا پہلا سفر

کسی کو کلاتہ اور بمبئی دیکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ کسی کو کشمیر حبت نظیر کی زیارت

کی تنہا مگر ہم کو نہ معلوم کیوں ہمیشہ سے لاہور دیکھنے کی تمنا تھی۔ بچپن ہی سے لاہور  
 میں ہمارے لئے خدا جانے کیا کشش تھی کہ ہمیشہ لاہور جانے کو دل چاہا۔ مگر یہ آرزو  
 کبھی پوری نہ ہو سکی۔ مگر جب اس تمنا کے بر آنے کا وقت آیا تو اچانک پوری ہی  
 بھی اس طرح ہو گئی کہ گمان تک نہ ہو سکتا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر محمد عمر صاحب نے  
 فرمایا۔ چلتے ہو پنجا ب۔ دل لئے کہا۔ نیکی اور پوچھ پوچھ وہ لاہور سے بھاوج صاحبہ  
 مسٹر عمر کو لینے جا رہے تھے اور ارادہ تھا کہ راستہ میں قادیان بھی ٹھہریں گے۔ چنانچہ  
 ہم ان کے ہمراہ ہو گئے۔ امرتسر پہنچ کر ہم لوگ قادیان کی طرف مڑ گئے۔ قادیان  
 پہنچ کر معلوم ہوا کہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب ڈلہوڑی تشریف لے گئے  
 ہیں پھر بھی تمام دن قادیان میں گزارا۔ قادیان کے مختلف شعبے سرسری طور پر دیکھ کر بہشتی  
 مقبرہ دیکھا۔ اخبار الفضل کے دفتر گئے۔ قاضی اکمل صاحب سے ملے۔ اور سہ پہر کو یہ سن کر کہ  
 آج ہی حضرت صاحب ڈلہوڑی سے شملہ جاتے ہوئے امرتسر سے گزریں گے ہم لوگ  
 واپس امرتسر آ گئے۔ اور امرتسر میں حضرت صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ خیال تھا کہ  
 ہم کو دیکھتے ہی احمدیت کی تبلیغ شروع کر دیں گے۔ ہم کو بیعت کی دعوت دی جائے گی  
 اور ہم جب انکار کریں گے تو ڈاکسٹر صاحب کو ہدایت دی جائے گی  
 کہ ان کو جماعت کالمیچر پڑھنے کو دیا جائے۔ مگر وہاں احمدیت کا کوئی ذکر  
 تھا نہ بیعت کا کوئی سوال نہ کوئی ایسی بات جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ ہم کو غیر  
 احمدی سمجھا جا رہا ہے۔ اور احمدی بنانے کی تحریک ہو رہی ہے۔ بلکہ بجائے  
 اس کے حضرت صاحب نے چہاذلی اور کچھ شاعرانہ گفتگو چھیڑ دی۔ تاکہ ہم کو چسپی  
 ہو سکے۔ سب نے لے کر دیفر شمنٹ روم میں بہت دستانہ کھانا کھایا اور اس

کے بعد حضرت صاحب شملہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس پہلی ملاقات میں ان کی گفتگو کا رخ زیادہ تر سیاسیات کی طرف تھا۔ اور ہم صرف یہ اندازہ کر سکے کہ ان کی مذہبی حیثیت تو درکنار ان کی سیاسی حیثیت بھی نہایت بلند ہونا چاہئے جو عمیق نظر ان کی سیاست کی باریکیوں پر پڑی تھی۔ وہ صرف ایک مشاق ماہر سیاست کی نہ ہو سکتی تھی، ادبی معاملات میں جو گفتگو آپ نے فرمائی وہ خالص ادبی رنگ لئے ہوئے تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ایک منجھا ہوا ادیب یہ باتیں کر رہا ہے ان تمام باتوں کے علاوہ نگاہیں نیچی بنوں پر تبسم اور آواز میں ایک دلکشی غائب ان ہی باتوں کو غیر احمدی قادیانیوں کی جادوگری کہتے ہوں گے۔

## لاہور کی سیر

امرتسر سے رخصت ہو کر ہم لوگ لاہور پہنچے، ڈاکٹر صاحب اپنی سسرال میں اور ہم اپنے دوست میاں ایم اسلم کے یہاں ٹھہر گئے۔ اسلم صاحب نے مدارات کی حد کر دی۔ لاہور میں ہمارے لئے کھنوسک کے آم فراہم کر دیئے۔ بات بات پر سکجبین، پھلوں کے عسرق اور دسترخوان بالکل واجد علی شاہی۔ آپ ہی کے یہاں سب سے پہلے پنڈت ہری چند اختر، درخشی علم الدین سائلک، اور غالب ڈاکٹر تاثیر سے ملاقات ہوئی۔ اور نوہ جا کر سید امتیاز علی صاحب تاج شمس العلماء مولوی ممتاز علی صاحب اور عبدالحمید صاحب سائلک سے پھر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جہانگیر کا مقبرہ، شالاباغ، ڈاکٹر اقبال اور سر عبدالقادر کو دیکھا ان دونوں بزرگوں کا ذکر تاریخی مقامات کے ساتھ اس لئے آگیا ہے کہ چھترات بجائے خود

## سر محمد اقبال

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سر عبد القادر اور ڈاکٹر اقبال کے یہاں پہونچے۔ سر عبد القادر سے قطعی ویر گفتگو ہوتی رہی آپ نے ایک مرتبہ بھی یہ اندازہ نہ ہونے دیا کہ آپ پنجابی ہیں۔ تان کا بالکل صحیح تلفظ اور لب و لہجہ میں اردو سے بغاوت نہ تھی جو عام طور پر پنجاب میں نظر آتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آپ سے تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ آپ ایک مقدمہ میں کچھ مصروف تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں ٹھاٹھی کچھ دوسرے تھے۔ نام کے ساتھ سر ضرور لگا ہوا تھا۔ مگر وضع عجیب و دریشانہ تھی۔ ایک تہ بند باندھے و زمین حاضرین سے بیٹھے گفتگو کر رہے تھے اور حقہ چل رہا تھا۔ حاضرین میں ایک صاحب ہمارے بھی جاننے والے تھے یعنی محمد عسکری صاحب مجاز، لکھنوی آپ خدا کے منکر اور مذہبیات میں ایک انقلاب عظیم کے علمبردار تھے۔ لوگ ان کو مجذوب سمجھا کرتے تھے ہم نے ان سے دریافت کیا کہ آپ لاہور کب اور کیسے تشریف لائے۔ سر محمد اقبال نے زیریں تبسم کے ساتھ فرمایا کہ آپ میری زبان درست کہنے اور مجھ کو زبان کے سلسلہ میں مشورے دینے تشریف لائے ہوئے ہیں محبت اتری صاحب نے انگساری کے ساتھ تبسم فرمایا۔ گویا ڈاکٹر صاحب سچ کہہ رہے ہیں۔ مگر بندہ کس قابل ہے اس وقت تو ڈاکٹر صاحب سے تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی لیکن دوسرے دن ہم چپکے سے پھر حاضر ہوئے۔ مگر اس وقت بھی کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے

یہاں اس وقت موضوع بحث یہ تھا کہ فحشیات اور دوزبان کے لٹریچر سے جو ارب  
 ایک باہر تھیں یہ غنم کھلم کھلا سامنے آچکا ہے۔ اسی بحث کے سلسلہ میں ہم نے ڈاکٹر  
 صاحب کو رفیع احمد خاں کا ایک شعر اسی رنگ کا سنایا۔ ڈاکٹر صاحب اٹھ کر  
 بیٹھ گئے۔ شعر پھر پڑھنے کی فرمائش فرمائی۔ اور آخر کار باقی حضرات سے یہ نصیحت  
 ہو کر ہم کو جانے کی اجازت نہ دی اور حکم دیا کہ ان صاحب کے اور شعریاد  
 ہوں تو سننا کہ ہم نے کافی شعر سنائے۔ تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ بڑی خیریت ہوئی  
 کہ حضرت اس طرف متوجہ ہو گئے۔ اگر سنجیدگی کے ساتھ عام شاعری فرماتے تو  
 بہت سے شاعروں کا پتہ نہ چلتا۔ کہ کیا ہوئے۔ اس ملاقات کے بعد ڈاکٹر صاحب  
 سے پھر کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔

## پھر سرینچ

سرینچ تو اپنا تھا ہی۔ مگر اب تک سرینچ سے کسی قسم کا کوئی مالی معاملہ سوائے  
 اس کے نہ ہوا تھا کہ جس مکان میں ہم رہتے تھے۔ اس کا کرایہ دفتر کی طرف سے دیا  
 جاتا تھا۔ مگر مہند کے بعد تو گویا سرینچ کو ہماری پوری کفالت کرنا تھی۔ چنانچہ  
 نیب صاحب سے باقاعدہ معاملات طے ہوئے۔ اور ہم نے سرینچ کی ذمہ دارانہ ذمہ داری  
 انجام دینا شروع کر دیں۔ اب تک سرینچ ہمارا تھا۔ اور اب ہم سرینچ کے ہو گئے۔  
 مگر سرینچ کی مالی حالت اس وقت ایسی نہ تھی کہ وہ یہ ہاتھی بانہ سکتا پھر  
 کچھ کچھ نہ کچھ روپیہ ہم کو دفتر سے حسب قرار داتا رہتا تھا۔ اور ہم کو کوئی خاتون کلیدی  
 نہ تھی۔ گھر کی صفائیں بھی درست تھیں۔ بیوی کو اب ہماری غیر ضروریوں کا شکوہ نہ



تھا۔ مگر وہ جو اطمینان ان تمام واقعات سے پہلے ان کو ہماری طرف سے تھا۔ وہ  
اب باقی نہ رہا تھا۔ اور وہ برابر شکوک و ظنوں سے ہم کو دیکھا کرتی تھیں کہ خیر  
جائے یہ رت کب پھر اسی راستہ پر لگ جائیں وہ تو وہ ہم خود اپنے ارادوں میں  
کچھ مستقل نظر نہ آتے تھے مدیح احمد خاں سے ملاقاتیں اب بھی ہوتی تھیں مگر وہ ہر وقت  
کاسا تھا تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ ہم اس دور کی تلافی کرنا چاہتے تھے مگر تلافی کر سکیں  
گے یا نہیں اس کا ہم کو ابھی تک یقین نہ تھا

## رسالہ شباب

نسیم صاحب کے پاس اگر کہیں ان کے حوصلہ کے برابر وہ یہ بھی ہوتا تو یہ بلا کا  
از خود رفتہ انسان نہ جائے کہاں پہنچتا۔ کبھی پیسہ کوڑی کی نشوونما میں وہ وہ پیراگ  
ان حضرات نے کھیلے کہ لوگ یہ سن کر حیران رہ جاتے تھے کہ نسیم سرما یہ دار نہیں بلکہ  
مزدور ہیں۔ سرچنگ کے ہوسالنے آپ نے نکالے ہیں۔ وہ ممکن ہے کہ پنجاب کے  
خباہروں کے لئے مہولی بات سمجھ جائیں۔ مگر یوٹی میں یہ جو حوصلہ ہوتا ان ہی  
حضرت کے حصے میں آیا تھا۔ حریم کے خاص نمبر نکالنا ان کے لئے ایک عام بات  
ہو کر رہ گئی تھی۔ اب آپ سرچنگ کا ایک ماہوار فلم ایڈیشن بھی نکال رہے تھے جو  
باقاعدہ ایک مہرور رسالہ تھا۔ اور اس کا سالنامہ تو ایسا نکالا تھا کہ آج  
تک اس کی دھوم ہے۔ اسی زمانہ میں آپ کو یہ بھی سوچنی کہ ایک خالص ادبی  
قسم کا ماہنامہ نکالا جائے۔ نام تجویز ہوا شباب ایڈیٹر ہوئے یہ شباب  
کی حدود سے منقریب گزرنے والے شوکت تھا نوی۔ نسیم صاحب کے زیر اہتمام

کوئی سکندر کلاس چیز نہیں نکل سکتی تھی۔ نہایت شاندار یہ رسالہ بھی نکلا چوٹی کے لکھنے والوں نے مضامین دیئے۔ لوگوں نے بڑی بڑی توقعات اس رسالہ سے کیں وابستہ کریں اس لئے کہ یہ بھی سرینچ جرنلس کا ایک سنگوفہ تھا۔ چار پانچ نمبر بڑی دھوم سے نکلا مگر اس کا نہایت ناگوار اثر سرینچ پر پڑنے لگا اور آخر کار اسے یہ کرنا پڑا کہ سرینچ اور شباب دونوں میں سے کسی کو نہیں پو قربان کر دیا جائے۔ آخر سرینچ پر ہم نے اپنا انتخاب متعربان کر دیا۔ اور لوگوں سے کہہ دیا کہ بوڑھے منہ یہ ہلے۔ آپسے نہ معلوم ہوتے تھے۔ حالانکہ لوگوں کے لئے یہ تماشہ بھی بے حد دلچسپ تھا۔

## ریڈیو ٹاکر

اسی زمانہ میں دہلی سے مولوی محمد حسین آزاد کے نواسے آغا محمد اشرف صاحب جو آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھے۔ سرکاری طور پر دورہ کرتے ہوئے بکینہہ بھی تشریف لائے اور ہم کو ڈھونڈ کر ہائے پاس پہنچے آپ نے ہم کو دھسلی سے ایک آدمی تقریر براڈ کاسٹ کرنے کے لئے کنٹرکٹ فارم پر دستخط کرائے اور آخر ہم تاریخ پر دہلی سے براڈ کاسٹ کرنے پہنچ گئے۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر جہانے کا صرف پہلا اتفاق ہی نہ تھا بلکہ خواہ کوئی کتنا ہی بیوقوف کیوں نہ سمجھے ہم کو یہ عرض کرنے میں شرمنا نہ چاہئے کہ اب سے پہلے ہم نے کبھی ریڈیو تک نہ سنا تھا۔ مگر اب ریڈیو سننے والوں کو اپنی آواز سنانا چاہتے تھے یہاں آغا اشرف صاحب کے علاوہ اسرار الحق صاحب مجاز سے بھی ملاقات ہوئی۔ جو رسالہ آواز یعنی ریڈیو کے اردو رسالہ کے ایڈیٹر تھے۔ اور جن سے ہم پہلے ہی لکھنا اور دہلی

میں متعدد بار مل چکے تھے۔ مجاز صاحب نے اسی وقت ہم کو ذوالفقار صاحب بخاری اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ملایا جو خصوصیت کیساتھ ہم سے ملے اور اسی دن شام کو نئی دہلی کے نہایت شاندار ہوٹل میں ہم کو چاہر پر مدعو کر دیا۔ بخاری نہایت تیز ذہین اور ساتھ ہی ساتھ اپنی چلت پھرت سے خاص طور پر ریڈیو کے لئے موزوں ترین شخصیت ثابت ہوئے۔ آپ سے شام تک اس حد تک بے تکلفی ہو چکی تھی کہ آپ نے اپنا کلام بھی سنایا اور ہر طرح ہم کو اس بات کا یقین دلادیا کہ ریڈیو میں ہمارے لئے کوئی اجنبیت نہیں ہونا چاہئے معلوم یہ ہوتا تھا کہ ان سے آج ہی ملاقات نہیں ہوئی ہے بلکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو مدت سے جانتے ہیں۔ ہم نے مقررہ وقت پر اپنی تقریر براڈ کاسٹ کی۔ چکا لیا اور چلے آئے۔ پندرہ دن کے بعد دوسری تقریر تھی۔ اس موقع پر بھی بخاری صاحب بہت ہی خصوصیت سے پیش آئے۔ اس روز ہم تقریر ختم کر کے اسٹڈیو سے نکلے تو ہم کو اطلاع دی گئی کہ فیاض احمد صاحب کوئی بزرگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اور ملاقات کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ ہم نے دماغ پر لاکھ لاکھ زور دیا کہ ہمارے کس دوست کا نام فیاض احمد ہے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اب جو ملاقات کے کمرے میں پہنچتے ہیں تو چچا میاں تشریف فرما تھے بڑے پیار سے فرمایا۔ شیطان کہیں کا۔ میں تیری شرارتیں سن رہا تھا۔ ابھی دہلی آیا ہوا تھا۔ سنا کہ تم بھی یہیں ہو۔ تم سے ملنے آگیا چچا میاں سے تقریباً آٹھ سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔ ان ہی کے ساتھ ان کی ہمیشہ نسبیتی کے یہاں گئے۔ رات کا کھانا دہلی کھایا۔ اور یہ وعدہ کر لیا کہ اب کی مرتبہ آیا تو آپ کو اطلاع کر دوں گا۔ چنانچہ اب یہ معمول ہو گیا کہ دہلی آنے سے پہلے اپنے براڈ کاسٹ کی تاریخ کی اطلاع

تھانہ بھون بھیجتے تھے۔ اور وہاں سے چچامیاں دہلی آجایا کرتے تھے

## بیوی سسرال گئیں

ہماری والدہ صاحبہ نے ایک ریکارڈ قائم کیا تھا۔ یعنی شادی کے بعد سے بیوگی تک کبھی آپ اپنی سسرال تشریف نہیں لے گئیں۔ اور نہ والد صاحب ان کو لے گئے۔ اس لئے کہ خود ان کو اپنے گھر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حالانکہ کہتے ہی تھے کہ میں جس نشان کے ساتھ بیوی کو تھانہ بھون لے جانا چاہتا ہوں۔ اس کا امکان ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کہ ان کو لے کر جاؤں۔ مختصر یہ کہ وہ اس امکان کا انتظار کرتے ہی کرتے اپنے حقیقی وطن روانہ ہو گئے۔ اور والدہ صاحبہ میکے ہی میں سہان بن کر میکے میں بیوہ بن کر رہ گئیں۔ اور رخصتی کی گویا کبھی نوبت ہی نہ آئی۔ مگر اس سلسلہ میں ہماری بیوی تیز نکلیں۔ ان کو جب یہ معلوم ہوا کہ چچامیاں ہر براڈ کاسٹ کے موقع پر دہلی آجایا کرتے ہیں۔ اور کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ وہیں اور بچوں کو لے کر آؤ۔ تھانہ بھون۔ تو ایک مرتبہ آپ ہمارے ساتھ دہلی چلنے کو تیار ہوئیں اور پردگراں یہ بنایا کہ دہلی کی سیر وہاں سے منظر نگار کی روانگی جہاں ان کے علم محترم اور ہمارے برادر محترم ڈاکٹر محمد عمر صاحب صدر اسپتال کے انچارج تھے اور پھر منظر نگار سے تھانہ بھون کی روانگی۔ چنانچہ دہلی پہنچ کر آپ نے پہلے تو دہلی کے سیر سپاٹے کئے۔ کبھی جامع مسجد میں ہیں۔ تو کبھی چاندنی چوک میں۔ کبھی قطب مینار کی سیر ہو رہی ہے۔ تو کبھی اوکھلے کی اور آخر شام کو جب ہم براڈ کاسٹ کرنے پہنچے تو آپ ہمارے ہمراہ ریڈیو اسٹیشن پر بھی موجود تھیں۔ اور ریڈیو اسٹیشن کا معائنہ

کرنا چاہتی تھیں۔ یہ بھی دیکھنا منظور تھا کہ براڈ کاسٹ کرتے وقت ان کا شوہر کیا معلوم ہوتا ہے اور اس کو آخر کس مشین میں رکھ دیا جاتا ہے۔ کہ یہ بولنے لگتا ہے تحقیقات پر معلوم ہوا کہ کوئی صاحب میں مہرا جو ڈیوٹی پر ہیں۔ وہی ریڈیو اسٹیشن کی سیر کراویں گے۔ چنانچہ پہلی مرتبہ براورم جنگل کشور صاحب مہرا سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے نہایت خشک مگر نہایت مہذب طریقہ پر ریڈیو اسٹیشن کی سیر بیوی کو کرائی ایک ایک بات سمجھائی کہ اس طرح براڈ کاسٹ کیا جاتا ہے یوں آواز ٹرانسمیٹر تک جاتی ہے، اور وہاں سے اس طرح نشر ہو جاتی ہے جنگل صاحب کے متعلق اس روز ہم صبر نہ کیا ہی رائے قائم کر کے رہ گئے۔ کہ یا تو یہ حضرت نہایت آدم بیزار ہیں۔ ورنہ خود اپنی زندگی سے بےزار ہیں۔ اخلاقاً بھی تو آپ کے چہرے پر ہنسی نہ آئی۔ حالانکہ ہم نے زندگی بھر شاید ہی کسی کے متعلق اتنی غلط رائے قائم کی ہو۔ جتنی جنگل صاحب کے متعلق یہ رائے قائم کی تھی۔ وہاں تو بیزاری کا سوال ہی نہیں باغ و بہار قسم کا ایک ایسا دوست جو بچائے خود ایک انجن کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہر حال جنگل صاحب کے متعلق کچھ عرض کرنے کا یہ موقع نہیں ہے ان کے متعلق تو بہت کچھ کہنا ہے جو آئندہ کہا جائے گا۔ مختصر یہ کہ دہلی کے اس تمام سیر سپاٹے کے بعد سبیکم صاحبہ ہائے اور اپنے خسر محترم یعنی چچا میاں کے ساتھ مع دونوں بچوں کے مظفر نگر روانہ ہو گئیں۔

مظفر نگر کے اسٹیشن پر عجیب منتظر ہائے سامنے تھا۔ ایک طرف تو ڈاکٹر محمد عمر صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کو لینے۔ دوسری طرف خان بہادر کنور عنتا علی صاحب کے یہاں سے ایک پردہ دار کار آئی تھی چچا میاں کی بہو کو اتارنے

چنانچہ چامبیاں نے اپنے زیر اہتمام پلیٹ فارم پر چار ری تنوانا شروع کر دیں ڈاکٹر صاحب نے ایک منٹ تو یہ تماشادیکھا اور اس کے بعد چامبیاں سے کہا سٹے جناب یہاں یہ میرے یہاں آئی ہیں۔ اور میرے طریقہ پر میرے ساتھ جائیں گی جب آپ تھانہ بھون لے جائیں۔ اس وقت آپ کو اختیار ہے۔ یہ کہہ کر سنیوہ کا پکڑا ہاتھ اور اپنی کھلی کار پر لے کر انہیں اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ چامبیاں خاموش رہ گئے۔ منظر نگار میں اپنے والد کے احباب اور چامبیاں کے دوستوں سے مل کر اور ایک آدھ دعوت کھا کر تیسرے روز بلدیہ کار تھانہ بھون روانہ ہو گئے۔ جہاں جانے کی میرے بچوں کو اس قدر خوشی تھی کہ چھوٹا بچہ خورشید تمام راستہ کار کے سامنے والے ہر بوٹی سے چیخ کر کہتا تھا۔ اُسے گلے ہٹا ہم واوی کے پاس جاتے ہیں۔

## تھانہ بھون

تھانہ بھون آئے کا ہمارے لئے یہ دوسرا اتفاق تھا۔ اور بڑی بچوں کے لیے پہلا اتفاق پہلی مرتبہ بہت ہی کم سنی میں آئے تھے۔ ہماری چچی بھی دوسری تھیں اور تھانہ بھون کے دوسرے حالات تو درکنار چچی تک بدل چکی تھیں۔ ہمارے ساتھ اس وقت وہ چچی نہایت محبت سے پیش آئی تھیں۔ اور اب یہ چچی بہت ہی محبت سے ہماری بیوی اور بچوں کے ساتھ پیش آرہی تھیں۔ تھانہ بھون کے لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کا ایک غریب الوطن بھائی تھانہ بھون آ رہا ہے۔ تو ایک اجتماع سب نے مل کر کیا۔ اور ہم کو اس میں بلا کر سب ہم سے ملے۔ محفل مشاعرہ منعقد کی گئی وغیرہ ہوئیں۔ اور آخر چار پانچ روز کے قیام کے بعد ہم تھانہ بھون سے لکھنؤ روانہ ہو گئے۔

ہلکے آنے کی خبر سہارنپور تک پہنچ چکی تھی۔ اور سہارنپور کے لوگوں کو ہمارا پروردگار م  
 معلوم ہو گیا تھا۔ لہذا اب سہارنپور کے اسٹیشن پر ایک حملہ ہوا۔ دس بارہ شاعر  
 قسیم کے اہل وطن نے ہم کو گھیر لیا۔ کہ ایک دن سہارنپور میں بھی رہت پڑے گا  
 مگر ہم اپنی مجبوریوں کے اظہار کے بعد آزاد کر دیئے گئے۔ البتہ اتنا فائدہ ضرور  
 ہوا کہ ان حضرات کی مدد سے سہارنپور سے کھنڈ تک نہایت آرام و سفر کا انتظام  
 ہو گیا۔ اور تمام راستہ اس طرح گزرا گویا ہم نے ایک ڈیرہ اپنے اس مختلف خاندان  
 کے لئے مخصوص کر لیا تھا۔

## سادھو

وطن جانے کو تو چلے گئے اور بحیریت تمام واپس بھی آ گئے۔ مگر معلوم ہوا کہ والد  
 صاحب نے اپنے بال بچوں کو وطن نہ لے جانے کی جس دانشمندی سے ہمیشہ کام لیا  
 تھا وہ کیا تھی۔ ہماری بیوی کو جب تھانہ بھون کے اعزہ میں گشت کرایا گیا تو ان  
 کو عجیب عجیب باتیں سننا پڑیں۔ مثلاً ایک جگہ کہا گیا کہ یہ "سادھو" کہاں سے  
 آ گیا ہے۔ یعنی وہ ساری باندھے ہوئے تھیں۔ اور سوائے بندوں اور چوڑی کے جسم  
 پر کوئی زیور نہ تھا۔ اور تھانہ بھون میں اس وقت تک عورت کو عورت کا درجہ حاصل  
 ہوتا ہی نہیں سکتا۔ جب تک وہ سر سے پیر تک زیور میں لدی ہوئی نہ ہو۔ کسی نے  
 کہا میسرہ صاحب ہیں کسی نے شفقت برتی تو میسرہ سے کہہ دیا۔ دلہن تنگی ہی چلی  
 نہیں۔ تنگی سے مطلب کپڑوں کے بغیر چلے آنے سے نہ تھا۔ بلکہ تھانہ بھون میں عورت  
 کی ستر پوشی اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی۔ جب تک اس کے کپڑے اس کے زیور

سے نہ چھپ جائیں۔ ہماری بیوی کے پاس اول تو اتنے زیور ہی نہ تھے اور اگر ہوتے تو بھی وہ اس طرح زیورات کی چلتی پھرتی دکان بن کر ہرگز نہ جاتی۔ ہم تو نہایت بے تکلفی سے اپنے گھر گئے تھے۔ زیورات کی کسی تلاش میں نہیں گئے تھے۔ دل دکھانے اور دل دیکھنے کی تمنا تھی۔ کڑے بچھڑے اور پازیب کی جھنکاریں سنانے نہ گئے تھے۔ نہ سننے کا اشتیاق تھا۔ والد صاحب بھی غالباً یہ چاہتے ہونگے کہ بیوی کو پہلے سر سے پیر تک لادیں۔ تھا نہ بھون پہنچ کر بیوی کو سونے چاندی کے دریا بہانے کے قابل بنا دیں۔ اس وقت وطن لے جائیں تاکہ وہاں بھی لوگوں کو معلوم ہو کہ محل والی ہو آئی ہے۔ جب بیوی نے ہم کو اہل وطن کے یہ ریمارک سنائے تو ہم مسکرا کر رہ گئے اور ہم نے ان سے کہا کہ والد صاحب کی اس مصلحت کے آخر کچھ تو معنی تھے۔ اور ہم نے ان سے کہا کہ والد صاحب کے کبھی سسرال نہ جانے کا کوئی مفہوم تو ہونا ہی چاہئے تھا۔

## گہرستان

میری نظموں اور غزلوں کا مجموعہ گہرستان کے نام سے عرصہ سے زیر ترتیب تھا اور میں اس کو خود چھاپنا چاہتا تھا۔ برادر محترم مولوی محمد عثمان صاحب اسدی نے اس طباعت کے لئے تمام انتظامات اس طرح کر دیئے تھے کہ جلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ چیت بنیم ہم کو صرف نہ کرنا بھی نہیں پڑا اور کتاب بھی خود ہم نے چھاپ لی۔ اس مجموعہ کا مقدمہ برادر محترم خاقان بہادر خاں صاحب مرزا جعفر علی خاں صاحب آثر ایم ای ای وزیر ریاست کشمیر نے لکھا۔ اور ہم نے



اس کو خان بہادر نواب بہادر ڈاکٹر نواب سر محمد منزل اللہ قیاس صاحب کے  
 سی بی، اسی کے نام معنون کر دیا۔ نواب بہادر صاحب نے لکھا کہ آپ اس مجموعہ  
 کو لے کر خود علی گڑھ آجائیے۔ چنانچہ کتاب کے پریس سے آنے ہی ہم اسے لیکر  
 نواب بہادر صاحب کے منزل پریس علی گڑھ حاضر ہوئے۔ اس موقع پر نواب  
 صاحب بہادر نے ہماری نہ صرف بہت زیادہ آؤ بھگت کی بلکہ ہمارے اعزاز  
 میں اپنے یہاں اپنے احباب کو ایک پارٹی دے کر ہمارا سب سے تعارف کرایا۔ اور  
 ایک چھوٹی سی تقریر میں فرمایا کہ میں شوکت تھانوی سے بحیثیت ایک سزا گار کے  
 واقف تھا، مگر بحیثیت شاعر کے آج ان سے ملا ہوں تو اس موقع پر خود غرض بننا نہیں  
 چاہتا ہوں کہ ان کی شاعرانہ صلاحیت سے میرے تمام دوست جن کو میں یہاں بلایا  
 کر سکا ہوں۔ لطف اندوز نہ ہوں اس کے بعد دیر تک ہم نظمیں اور غزلیں سناتے رہے  
 نواب بہادر صاحب نے اپنے اثر سے اور خود اپنے احباب کے اثر سے نہ صرف ہماری  
 کتابوں کے کافی خریدار دوائے۔ بلکہ ہم کو بہت اصرار کے ساتھ واپسی کے وقت  
 کچھ تحائف اور کچھ نقد بھی مرحمت فرمایا۔ جس کو قبول کرنا ہم نے اس لئے باعث  
 شرم نہ سمجھا کہ اول تو نواب بہادر صاحب واقعی بزرگانہ شفقت کے ساتھ  
 پیش آئے تھے۔ دوسرے ہمارا ارادہ تھا کہ ہم خود اپنا بک ڈپو قائم کریں  
 گے لہذا اس کے لئے سرمایہ کی ضرورت بھی پیشی۔ نواب بہادر صاحب سے اس  
 ملاقات کے بعد بھی جس کسی کی ہم نے کوئی سفارش کر دی یا جس ادارہ کو نواب  
 بہادر صاحب کچھ دلوانا چاہا کبھی اس سلسلہ میں ہم کو ایس نہیں کیا گیا۔ اور خود ہم کو نواب  
 بہادر صاحب نے مختلف مواقع پر جواہر پینجائی ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

## سرمحمد ظفر اللہ خاں

گہرستان کی ایک بلند ہوا و بر محترم مولوی محمد عثمان صاحب احمدی نے  
 انریپل چوہدری سرمحمد ظفر اللہ خاں کو بھی بھیجی تھی جو دوسری صاحب نے اس  
 کتاب کو گول میز کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لئے جاتے ہوئے اپنے ساتھ  
 رکھ لیا۔ اور اس پر عجیب حالات میں تذکرہ لکھ کر بھجوا۔ جو رسالہ نیزنگ خیال لاہور  
 میں چھپ چکا ہے۔ یوں تو گہرستان پر علامہ سر محمد اقبال، سر شاہ محمد سلیمان  
 چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ، سر محمد نزل خاں، سر سید یاقوت علی وغیرہ  
 بہت سے بزرگوں نے تذکرہ کیا تھا۔ مگر سرمحمد ظفر اللہ کا یہ تبصرہ رسمی اور فراموشی  
 قسم کا نہ تھا۔ سرمحمد ظفر اللہ نے فرمایا کہ یہ کتاب ایک سوٹ کیس میں رکھی ہوئی تھی  
 اور وہ سوٹ کیس اسی سفر میں ایک جگہ سندھ میں جاگرا۔ بمشکل تمام اس کو نکالا گیا  
 اور گہرستان کو پھر میں احتیاط کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا۔ اسی تبصرہ میں ایک  
 جگہ سرمحمد ظفر اللہ خاں نے عجیب بات فرمائی ہے۔

”میں تو شوکت صاحب کی دلی کیفیات کا اندازہ

کر کے خوش ہو رہا ہوں اور لطف اندوز بھی اور

ساتھ ہی ساتھ مجھے یقین بھی ہے کہ شوکت صاحب

کو یہ احساس ہو گا کہ میں ان کے تختہ کی پرواز اور

فکر کی گہرائیوں سے بالکل بے بہرہ ہوں۔ صاحب

کلام ایک کیفیت کا اظہار ایک خاص ترکیب

الفاظ سے کرتا چاہتا ہے۔ پڑھنے والے اور  
سننے والے اپنے اپنے ذوق اور طرز کے  
مطابق اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ میں  
اگر شوکت صاحب فکر و تخیل کا مالک ہوتا تو میں  
بھی اپنی کیفیات قلبی کو مزین الفاظ اور مرصع  
ترکیبوں میں ادا کر سکتا۔

اس اقتباس کے بعد ایک لطیفہ پیش کیا جاتا ہے۔ کہ بریلی کے ایک رئیس اکثر  
اس خاکسار سے کلام سنانے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ اور اس خاکسار کا دم  
نکل جایا کرتا تھا۔ اس فرمائش پر۔ اس لئے کہ پھر شروع ہوتے تھے۔ ان کے وہ  
تبصرے جن کا ہمارے پیچھے شعر سے دور کا تعلق بھی نہ ہوتا تھا۔ کہنے لگے۔  
میاں ٹھہر دو دوسرا مصرعہ بھی نہ پڑھنا۔ پتہ بھی ہے تم کو کیا کہہ دیا ہے۔  
تم نے یہ کہا ہے۔ یہ کہا ہے اور یہ کہا ہے۔ یعنی جو ہم نے نہیں کہا تھا۔ وہ سب یہ  
بزدل گفرا جاتے تھے۔ اور آخر میں کہتے تھے کہ اب تم ہی بتاؤ کہ اس کے بعد دوسرے  
مصرعے کی کیا ضرورت رہ سکتی ہے پہلا ہی مکمل شعر ہے۔ اور دوسرا مصرعہ محض  
بھرتی کا ہوگا۔ جب دوسرا مصرعہ سنا تو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ آنکھیں  
بند کر کے کچھ غور فرمایا۔ اور ایک دم چونک کر بولے۔ نہیں صاحب دوسرے مصرعے  
نے حالات ہی بدل دیئے اب اس شعر کا مفہوم یہ ہوا اور یہ ہوا۔ یعنی جو  
کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ بیان فرما گئے۔ سر محمد ظفر اللہ خاں نے اس تبصرے میں سی  
ایک برقعہ پر بھی ہمارے کسی شعر کو کسی ایک رنگ میں پیش نہیں کیا ہے۔ جو ہمارے

مفہوم سے علیحدہ ہو۔ مگر بات یہ بالکل سچی کہی ہے کہ شاعر کچھ کہتا ہے اور سمجھنے والے اس کو اپنے اپنے رنگ میں سمجھا کرتے ہیں۔ ہماری ایک طانی صاحبہ ہیں آپ پڑھی لکھی تو خیر نہیں ہیں۔ مگر سخن شناس بہت ہیں۔ ہمارے شعر سننے کا بڑا شوق ہے اور ہر شعر سن کر یہی ایک بات ہمیشہ کہتی ہیں۔ کہ چاہے اس شعر کو ادھر ادھر لے جاؤ، چاہے ادھر لے جاؤ۔ مطلب ہوتا ہے "ادھر ادھر" کا حقیقت اور مجاز گریہ بائیں تو وہ جانتی نہیں۔ البتہ ادھر ادھر سے مفہوم پورا کر دیتی ہیں۔ مگر محمد ظفر اللہ کے اس بیان کی تصدیق و اقرار ان غالب کی مختلف شرحیں دیکھ کر کیجئے۔ کائنات غالب خود زندہ ہونے اور اپنا مفہوم خود بھی بیان کر سکتے۔

## طوفان تبسم

اپنا ایک ڈپو قائم کر کے کا مستقل خیال تھا۔ اب تک ہماری تین کتابیں نکل چکی تھیں۔ سوچے تبسم، تبسم، انہونی صاحب نے چھاپی تھیں "سید اب تبسم" صدر بن بکڑ پونے لہذا جو تھا مجموعہ "طوفان تبسم" اور گہرستان ہم نے خود چھاپے طوفان تبسم کے لئے بھی براہ درمختم مولوی محمد عثمان صاحب احمدی نے سر مایہ کا انتظام ایک ایسے بزرگ کے یہاں سے کرادیا جن کی پہلی شرط یہی تھی کہ اس کے نام کو اچھا لائے جائے۔ مولوی محمد عثمان صاحب احمدی نے ہماری تعمیری زندگی میں بہت کچھ ہاتھ ڈالتا چاہا۔ اور بہت کوشش کی کہ ہم کسی طرح اپنے پردوں پر کھر سے ہو جائیں۔ مگر وہ بچا سے کیا کرتے۔

مری تعمیر میں مضر تھی اک صورت خرابی کی

چنانچہ گہرستان اور طوفانِ تبسم کی اشاعت کے بعد اگر ہم اوسیت سے کام لیتے  
تو ایک چھوٹا سا بک ڈپو اپنا ذاتی ہو سکتا تھا۔ اور اب تک جو کچھ تبسم کتاب میں دوسرے  
ناشروں نے چھاپی ہیں۔ وہ ہم خود چھاپتے اور بچوں کے لئے کوئی  
مستقل سامان کر دیتے۔ مگر یہاں تو مقوز یہ تھا کہ کوڑی نہ رکھ کفن کو شرافت اسی وقت  
تک ساتھ دیتی تھی۔ جب تک روپیہ ساتھ چھوٹے رہتا تھا اور جہاں حبیب  
میں کچھ آیا۔ اس یہ فکر رہتی تھی کہ کسی طرح یہ صرف ہو کر جائے۔ کوئی چورالے،  
کوئی مانگ لے بختصر یہ کہ ہمارے پاس سے جائے۔ آج کل پھر ذرا کم بختی کا زور  
ہو رہا تھا۔ اور شامیں دور دور سے گھیرنے چلی آرہی تھیں۔

## پھروسی تاش اور وی ہم

کوئی نہ کوئی کاروبار ہونا چاہئے تھا۔ یا یوں کہئے کہ کاروبار وہ کرے جو بیکار  
ہو ہم خدا نخواستہ بیکار تو تھے نہیں کہ خواہ مخواہ بک ڈپو وغیرہ کھولتے پھرتے بقصد  
تو روپیہ رکانے سے۔ اور منافع کمانے سے تھا۔ لہذا ہم نے سب سے زیادہ چلتا  
ہوا کاروبار تاشوں کو سمجھا اس کاروبار میں نتیجہ فوراً معلوم ہوتا ہے یعنی یا تو دار  
نیائے در نہ ہائے تو بھاگے نانیائے۔ یہ کیا کہ افیونیوں کی طرح بیٹھے انتظار کر رہے  
ہیں کہ کب ڈاکیر قسمت کا فیصلہ سناتا ہے۔ کہ تمہارے لئے دی پی وصول ہو  
اور لئے داپس آئے۔ اس لغویت میں مبتلا ہونے کی بجائے ہم نے پھر تاش کھیلنا  
مشرع کر دیتے اور جو تھوڑا بہت سرمایہ تھا وہ اس کاروبار میں لگا دیا۔ دیکھئے کاروبار  
خواہ کوئی بھی ہو اس کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ نفع یا نقصان بڑی بڑی سرمایہ دار

کمپیاں بغیر تاش کھیلے خیل ہو جایا کرتی ہیں۔ بڑے بڑے ملک التجار اپنا دیوالہ  
 نکلوا دیتے ہیں اور اگر نفع ہونے والا ہوتا ہے تو مٹی اٹھا لیجئے سونا بن جائے  
 چنانچہ ہم تو اس سلسلہ میں تدبیر سے زیادہ تقدیر کے قائل تھے۔ اور تقدیر کی آتش  
 کا موقع جس قدر تاشوں میں حاصل ہوتا ہے اتنا کسی اور کاروبار میں حاصل نہیں ہو سکتا  
 تاش کھیلنے کے سلسلہ میں ہماری اس تجدید کا جشن احباب نے منایا۔ لوگ کجا ہوئے  
 نئے نئے چکنے چکنے تاش منگائے گئے۔ اور ہم پھر اسی مشغلہ میں ڈوب کر رہ گئے کاروبار  
 میں تو نفع اور نقصان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کبھی اپنی چاندی ہو جاتی تھی اور  
 کبھی کسی معاملہ میں خسارہ، دراصل تجارتی دنیا اسی جوار بھائے پر قائم ہے اور  
 تاشوں کے سلسلہ میں تو نہایت مشاق قسم کے کاروباری آدمی کی ضرورت ہوتی  
 ہے۔ جو نہ جوار دیکھے نہ بھسٹا۔ بس استقلال کے ساتھ ان تھپیڑوں سے  
 کھیلے۔ ڈوبتا ہے۔ ابھرتا ہے۔ جو ڈوبے گا وہی موتی نکالے گا۔  
 اور جوار بھرنے کے بعد پھر ڈوبنے سے ڈرا یہ سمجھ لیجئے کہ پھر وہ ڈوبا ہمیشہ  
 کے لئے روپیہ پیسہ کیا ہے۔ ہاتھ کا میل۔ دولت یعنی دولتوں والی چلتی  
 پھرتی چیز۔ ان چیزوں کا کیا بھروسہ، قارون نے جمع کیا تھا تو کیا پایا۔ حاتم نے  
 صرف کیا تھا۔ آج تک نام ہے۔ اصلی چیز تو دل ہے۔ بس دل بڑا ہونا چاہئے  
 انسان کا۔ انشاء اللہ زندگی بھر فاتے کرے گا۔ خصوصاً ایک تاش کھیلنے والے  
 کا دل تو اتنا بڑا ہونا چاہئے کہ اس پر گرم رس دو دونوں کا اثر نہ ہو۔ اگر جتنے سے  
 زیادہ خوش ہو گیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہانسنے کی تاب لا ہی نہ سکے گا اور  
 ہار کر اگر بہت بد دل ہو گیا۔ تو اس کا مفہوم یہ ہوا کہ وہ ہمیشہ ہار سے ڈر کر رہ جائے

گلا اور بازی لگانے کے لئے جس جسارت کی ضرورت ہے۔ وہ اس غریب میں کبھی پیدا نہ ہو سکے گی۔ دراصل تاش کے تمام لطف کاراز وہ خطر ہے جو بازی لگا کر کھلاڑی حاصل کرتا ہے اس خطرے میں پڑ کر ناکامی سے ڈرنا ہی نہ چاہئے۔ اس لئے کہ ناکامی اس خطرے سے زیادہ خطرناک تو ہو ہی نہیں سکتی لیکن اگر کامیابی ہو گئی تو انسان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس نے وہ کام کیا ہے جو رستم سے نہ ہو گا۔ پھر یہ کہ اسی تاش کی بدولت انسان کو زندگی کے وہ قیمتی تجربے حاصل ہوتے ہیں جو کسی اور صورت سے کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتے۔ کسی دوست کو پرکھنا ہو ساتھ میں تاش کھیلنا اور لگا کر پرکھ لیجئے۔ اپنے ہرے سے نقاب ہٹا کر اصلی خدو خال میں آپ کے سامنے آجائے گا۔ بڑے بڑے یارانِ وفا طوطے کی طرح وقت پڑ جانے پر آنکھ بدل لیا کرتے ہیں۔ مگر خدا نہ کرے کہ آپ پر وقت پڑے پھر وقت پڑے ہی اگر تجربہ کرتا ہے۔ تو کسی دوست سے تاش کھیل کر دیکھ لیجئے، خواہ کتنا مکمل انسان کیوں نہ ہو۔ ایسا جواب طوطا ثابت ہو گا۔ کہ آپ خود نبی جی کھینچو پونے لگیں۔ اس سلسلہ کے بے شمار تجربات میں سے صرف ایک یہاں بیان کرنے کو دل چاہتا ہے۔ تاکہ ہم کو بھی کوئی نا تجربہ کار نہ کہہ سکے۔ رفیع احمد خاں صاحب کے اہل رہائے ایک مشترک دوست جن کی ہمہ گیر قابلیت سے ہم سب ہی نالاں تھے۔ اور جن کو ہم واقعی دوست جانتے تھے۔ بلکہ جوابات تک پہنچانے دوست ہر وقت کے ہم نشین اور ہر دھڑکھ درد کے شریک ہیں۔ ایک رات کھیل میں شریک ہوئے۔ صبح ہم کو دہلی روانہ ہونا تھا۔ اس لئے کہ دوسرے دن دہلی سے براؤ کا سٹ کرنا تھا۔ اس رات معاملات اس قدر ابتر ہوئے کہ ہم فاقہ تور روپے کے علاوہ دہلی

کا کرایہ تک ہار گئے اور ہمارے یہ دوست جیتے۔ کھیل کے اختتام پر ہم نے رفیع احمد خاں کے سامنے ان عزیز دوست سے عرض کیا آپ مجھ کو اس جیتے ہوئے روپے میں سے اتنا روپیہ قرض کے طور پر دے دیجئے۔ میں دہلی سے آتے ہی ادا کروں گا۔ معلوم یہ ہوا کہ گویا آپ سے کبھی کی جان پہچان ہی نہیں ہے۔ صاف انکار کر دیا۔ رفیع احمد خاں کو ان کے اس انکار پر ان سے زیادہ غصہ ہم پر آ رہا تھا کہ ہم نے آخر ان سے روپیہ کیوں مانگا۔ رفیع احمد خاں کے متعلق ہم کو معلوم تھا کہ یہ بھی ہائے ہیں۔ لہذا ان سے طلب کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ آخر ہم کو اسی وقت گھر جانا پڑا۔ حالانکہ گھر پر سب کو یہ معلوم تھا کہ ہم رات ہی کی کسی ٹرین سے دہلی روانہ ہو گئے ہیں۔ اور واقعی یہ رات ہم نے تاش کھیلنے کے لئے چوالی تھی۔ گھر جا کر بڑا ہلکا ہونے کا ایک افسانہ سب کو سنایا۔ اپنی رات بھر کی پریشانی کا ذکر کیا۔ اور روپیہ لے کر پھر دہلی روانہ ہو سکے۔ ہمارے یہ دوست آج بھی ہمارے سید غمگسار ہیں۔ جہاں ہمارا پسینہ گرے وہاں اپنا خون بہا دیں گے مگر جو کچھ ہوا تھا وہ ہم کچھ ہی چکے ہیں۔ ہم نے اپنے ان دوست سے پھر کبھی اس بات کی شکایت نہیں کی۔ مگر ہمارے دل پر اس قدر گہری نقش ہو چکی ہے کہ اگر ہم خود اس کو بھلانا چاہیں تو کبھی نہیں بھلا سکتے۔

## تاشوں کی دق

تاشوں کی دق۔ دق کی بے شمار قسموں میں سے ایک تندرست قسم کی دق ہے جس کے جراثیم پھیپھڑوں میں زخم نہیں ڈالتے بلکہ پرس اور جیب کو چھلنی



کر دیتے ہیں۔ ہم اس وق کے تیسرے نہیں بلکہ شاید بیسیویں چلیسیویں درجہ میں مبتلا  
 تھے۔ اور ہمارے صحت یاب ہونے کی اب کوئی امید نہ تھی معلوم نہیں کس کس کے  
 مقروض تھے گھر سے کیا کیا پرانے کر کے روپیہ لاتے تھے اور سب ان ہی تاشوں  
 کی نذر کر دیتے تھے۔ دنیا کا کوئی اور شوق تھا ہی نہیں مرض اس لئے بڑھ رہا تھا کہ  
 بیوی سے چوری تھی۔ اگر کھلم کھلا کھیلنے ہوتے تو شاید اتنی چوریاں کرنا نہ پریشانی  
 اور نگہ سے اس قدر غائب رہتے۔ ہم خود جانتے تھے کہ ہماری زندگی میں یہ گھن  
 لگ چکا ہے۔ ہم کہ یہ بھی معلوم تھا کہ ہم اس علت میں مبتلا نہ ہوتے تو ہمارے  
 بے ترقی کے امکانات موجود تھے اور اب بھی اگر تائب ہو جائیں تو ترقیوں کے  
 دروازے کھلے ہوئے ہیں مگر سنجیدگی سے بار بار کوشش کرنے کے باوجود پھر  
 اپنے کو اسی بلا میں گرفتار پاتے تھے۔ اور اس کا کوئی علاج اب تک ہماری  
 میں نہیں آ رہا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اس کا کوئی ناگوار اثر دماغ پر نہیں  
 پڑ رہا تھا۔ اور ہم بے حیائی کی عمر و رازہ اسی طرح بتا رہے تھے اور خوش تھے۔

## مرزا عالمگیر قدر

آپ بھی رفیع اصناف صاحب کے تاشوں کی گڈی سے برآمد ہوئے  
 تھے۔ ابھی مکمل ملاقات بھی نہ ہونے پائی تھی۔ کہ نہایت شفقت سے عزیزم اور صاحب  
 وغیرہ کہہ کر اپنی بزرگی کا سکہ ہم پر بٹھا دیا اور پھر شروع کر دی۔ وہی بزرگانہ ڈانٹ  
 ڈپٹ۔ پسند و نصیحت۔ ہر شخص کے ہر معاملہ میں دخل۔ ہر بات میں آپ کی طرف سے  
 ایک قول فیصل۔ ہر محبت پر معانات کا ایک دریا بہا گیتے ہیں۔ شعر سنائیے تو شمر

آپ کا ہوگا۔ اور مفہوم وہ بیان فرمائیں گے۔ لباس پہنے۔ تو اس کے تلنے بانے سے لے کر خیاط کی سوئی تک پر ایک مکمل تبصرہ فرما جائیں گے۔ بیمار پڑیے تو ڈاکٹر نسخہ لکھے گا۔ علاج آپ کریں گے۔ کسی کو یہاں ولادت ہو تو والدی کو طلب کر کے ضروری مشورے آپ دیں گے۔ حالانکہ سوائے اس کے کہ آپ خود توبہ پا ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کی اور کوئی معلومات آپ کو نہیں ہے۔ کسی کو چھینک آئی اور آپ نے اس کے مستقبل پر ایک دھواں دھار، تقریر فرمادی کہ اب اس کو رات کے بھیتے بھیتے ٹمپر ہو جائے گا۔ صبح تک اختناق الرحم کے دورے پڑنے لگیں گے۔ پھر انسائیکلو پیڈیا ہو جائے گا۔ اور اگر اس نے سنا ٹو جن کے انکیشن نہ لے تو کل شام تک اسی وقت اس کے پسینہ سے شکر آنے لگے گا۔ اور دماغ میں نیل پا پیدا ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ دراصل اس کو کانسٹینٹی نوپل کی شکایت ہے میاں۔ اس کا علاج جم کر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے پیروں میں بائیر کی شکایت پیدا ہو جائے۔ اسی مرض میں سیکڑوں آدمیوں کو مرتے ہوئے دیکھلے ہے کچھ پتہ نہیں چلا کہ لارڈ کچر مر کے ڈوبے یا ڈوب کے مرے۔ رنج احمد خاں اور ہم سب حیرت سے ان کا منہ دیکھتے تھے۔ اور وہ اپنی تمام سنجیدگیوں کے ساتھ اس طبی عقیدے کو سلجھاتے اور ہم سب کو اپنی قابلیت سے ابھاتے چلے جاتے تھے۔ ہر فن میں مہارت کا یہ عالم کہ کوئی ماہر موسیقی آگیا۔ اب آپ اس کے سر میں کہ استاد یہ گندھار میں جو بھیر وین کی تان آجاتی ہے۔ اسے اگر مالکوس کے سروں میں الاپ جائے تو میاں کی ٹوڈی کا اس میں آخر کیا نقصان ہے۔ یہ فرض کر لیجئے کہ ترانے میں آدھا سرگم ملہار کے طریقے پر ہو۔ اور آدھا لمپت اور درت دونوں کے حاصل ضرب سے

اڑانے کے طرز پر رکھا جائے تو کیا ٹھکانہ ہوگا۔ ماہر موسیقی اپنا ساز اٹھا کر اپنے سر پر اپنے پیر رکھتا۔ اور بھاگتا وہاں سے۔ اب آیا کوئی شاعر اور شامت اعمال سنا دیا اس نے اپنا کلام بس پہلا ہی مصرعہ سن کر ایک دم اچھل پڑے۔ ”میاں ٹھہر و کس قدر نازک بات کہہ دی ہے تم نے اب اس پر دوسرا مصرعہ لگاؤ گے تو پتہ چلے گا کیسے لوہے کے چنے چبانا پڑتے ہیں ذرا پھر پڑھو اس مصرعہ کو ع  
رات گزری نور کا ترٹ کا ہوا

کیا بات کہہ دی ہے رات گزری نہیں سکتی جب تک نور کا ترٹ کا نہ ہو اور نور کا ترٹ کا ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ رات گزر نہ جائے۔ پھر نور کا ترٹ کا کہا ہے اگر کہیں ترٹ کے کا نور کہہ دیتے تو مصرعہ پھسسا ہو کر رہ جاتا۔ مختلف پہلوں کے لئے اس مصرعہ میں اور پھر ردیف ”ہوا“ اس قدر استحکام اور انتظام کے ساتھ رکھ دی ہے۔ کہ ہلاٹے نہ ہلے۔ پھر قیامت یہ رکھی ہے کہ ترتیب کس قدر پاکیزہ ہے اگر اسی مصرعہ کو یوں کہتے کہ ع

### نور کا ترٹ کا ہوا اور گزری رات

تو واقعہ کے اعتبار سے مصرعہ مہل ہو جاتا۔ اس لئے کہ پہلے رات گزرتی ہے بعد میں نور کا ترٹ کا ہوتا ہے۔ لہذا ظالم نے یوں نہیں کہا ہے۔ بلکہ پہلے رات گزری ہے کہ ”رات گزری“ پھر نور کا ترٹ کا پیدا کیا ہے کہ ”نور کا ترٹ کا ہوا“ کس قدر برابر کے دونوں ٹکڑے ہیں۔ اور کیسے دست و گریباں۔ کوئی لفظ میچ سے ہٹا دیجئے مصرعہ ناموزوں ہو جائے گا۔ کوئی لفظ اور جوڑ دیجئے۔ تقطیع بدل جائے گی یہ کہلاتا ہے الترام۔ انتظام، اور اب دوسرے مصرعہ میں جو کچھ ہوگا۔ اس کا نام ہے انظم

شاعر نے بیاض اٹھائی جوتے چھوڑے اور وہ بھی بھاگتا اپنی ناک کی سیدھ میں  
 کہ شامت مارا کوئی آم والا آگیا اور آپ بیٹھ گئے اس کے ٹوکے کے لباس عینک لگا کر  
 اور شروع کر دیا۔ آموں پر تبصرہ کیوں بھئی یہ دسہری کی شکل کا کونسا آم ہے ہے  
 تو یہ دسہری ضرور مگر اس کی قلم میں کچھ شفقنا لکھنا لکھنا ہے۔ اور اس کے پیر کے ارد گرد  
 کہیں یا تو کھٹل کا درخت تھا اور نہ مالی نے قلم لگاتے وقت ارہر کی وال ضرور  
 کھائی تھی۔ اس کی خوشبو میں جو ایک قسم کی لہسنیت ہے وہ بغیر اس کے پیدا  
 ہو ہی نہیں سکتی۔ اور تم کو معلوم نہیں ہے کہ دسہری تمام آموں میں سب سے  
 زیادہ نازک آم ہوتا ہے اس کو لو جو لگتی ہے۔ اس کو تم لوگ بہت معمولی بات سمجھتے  
 ہو۔ حالانکہ اس کو اس سے بخار ہو جاتا ہے۔ اور خدا پناہ میں رکھے۔ آم کے سرس  
 سے نہایت سخت قسم کا ہوتا ہے۔ یہ حال یہ ہے کس حساب سے یا پھر روپے ڈھیر  
 کی توخیر کوئی بات نہیں بلکہ اس دسہری کو دیکھو یہ جو تہہ سائے سائے کچھ  
 مضمحل سا پڑا ہے۔ اس میں یقیناً شاہ بلوط کی آمیزش ہے۔ وزن بھی اس کا دسہری کے  
 عام وزن سے کچھ کم معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ جو اس کی کر دٹ میں ایک جھری پڑی ہے  
 اس کے معنی یہ ہیں کہ اس طرف کے تمام شیرینی کے ریشے پھٹ کر ڈالنے کو منتشر  
 کر چکے ہوں گے۔ خوشبو بھی نقلی سی معلوم ہوتی ہے۔ یہیں بھی نہیں۔ یہ تو ڈھالی  
 روپے سے زیادہ کی چیز نہیں۔ حالانکہ اگر وہ داس نہ لگاتے تو شاید وہ مفت ہی  
 میں تمام آم یہیں الٹ کر چلا جاتا۔

ان حضرات سے واسطہ پڑا تھا۔ اور آپ نے والد صاحب مرحوم کے متعلق  
 ایک ادھر روایت بیان کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ آپ ہمارے چچا ہیں لہذا

ہم آپ کو نہایت ادب سے چچا کہا کرتے تھے، اور آپ شفقت سے زیادہ ہر وقت  
 سرزنش میں مصروف رہتے تھے۔ آخر اس طریقے سے تنگ آکر ہم نے ایک دن  
 تمام احباب کے مجمع میں کہا کہ حضرات یا تو میں خود کشتی کی اجازت چاہتا ہوں۔  
 ورنہ ان حضرات کی بیوقوفی سے سیری جان بچا لیے بخواہ مخواہ کے یہ چچا بنے  
 ہوئے ہیں حالانکہ ان سے کہیں بہتر چچا بننے کی صلاحیت خود مجھ میں ہے اور  
 اگر مجھ کو ان کا چچا بننے کا موقع آپ حضرات دیں تو میں اپنی صلاحیت کے جوہر  
 دکھاسکوں گا۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ اس سلسلہ میں ہر سال ایک عام انتخاب ہوا  
 کرے اور اس میں ہم دونوں میں سے جو زیادہ ووٹ حاصل کرے۔ وہی اس سال  
 کے لئے چچا بنا کرے۔ ہمارے اس بیان لوگوں کی توجہ اس طرف ہوئی کہ واقعی اس قسم  
 کا موقع ان کو بھی ملنا چاہئے۔ کیا تمہیں ہے کہ یہ عالمگیر سے بہتر قسم کے چچا ثابت ہوں  
 چنانچہ اسی وقت عام احباب کو جمع کیا گیا جو موجود تھے۔ اول تو وہی کافی تھے گو ہم  
 پورا اعتبار مگر معاملہ چونکہ نازک تھا۔ لہذا پوسے ہاؤس کے سامنے پیش ہوا اور  
 دوسرے دن انتخاب کا وقت مقرر کر دیا گیا۔ تاکہ ہم دونوں اس عرصہ میں  
 اپنے اپنے لئے کنوینگ کر لیں۔ دوسرے دن عجیب عالم تھا۔ کبھی عالم سا کپڑا پہن  
 بھاری نظریں آتا تھا۔ کبھی ہمارے ووٹ ٹوٹ کر ادھر ہو جاتے تھے۔ کبھی  
 ان کے ووٹ ٹوٹ کر ہماری طرف آ جاتے تھے۔ آخر رائے شماری کا وقت آیا  
 رفیع احمد ناں پولنگ آفیسر مقرر ہوئے اور باقاعدہ ووٹ پڑنے لگے تھوڑی  
 ہی دیر میں پولنگ آفیسر نے نتیجہ سنا دیا۔ ہم کو تیرہ میں سے نو ووٹ ملے تھے  
 عالمگیر کو تین اور ایک ووٹ مشکوک ہو کر ستر و کر دیا گیا۔ عالمگیر نے اعلان

سننے ہی چچا کہہ کر ہم کو آداب کیا۔ اور ہم نے شفقت کے ساتھ ان کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔ لوگوں نے ہم کو مبارک باد دی اور ہم نے شکر گزار ہو کر کہا کہ دعا کیجئے کہ میں صحیح معنوں میں چچا ثابت ہو کر اس کی کچھ اصلاح کر سکوں

## اے آئی۔ سی۔ سی۔ کلب لکھنؤ

ریج احمد خاں صاحب کو آپریٹو سوسائٹیز کے دفتر میں ہیڈ اسسٹنٹ تھے۔ اور دفتر کے بعد وہیں دفتر کے پختہ کورٹ میں ٹینس کھیل کرتے تھے ٹینس کے ساتھ ہی ساتھ وہاں ایک کلب کی بنیاد پر سی۔ سی۔ کا نام انگریزی میں اے آئی۔ سی۔ سی۔ کلب رکھا گیا۔ اس کا واضح کرنا تو خیر ہمارے امکان میں نہیں ہے۔ البتہ نام کا ترجمہ یہ ہوا۔ آل انڈیا کو آپریٹو انجمن حمایت ماہاں لکھنؤ اس کلب کے صدر بدلتوں سے محمد احمد صاحب چلے آئے تھے اور طے یہ تھا کہ جس دن کوئی اور صاحب ان سے بڑھ کر اس منصب کے لئے اپنے استحقاق کا ثبوت دینا شروع کریں گے۔ اسی دن کلب کے ممبروں کی تائید حاصل کر کے اس عہدہ پر آجائیں گے۔ چنانچہ عدالتے باقی تو سب کو بچا یا مگر حکیم محمد ریڑ صاحب آخر کار اتفاق رائے سے صدر ہو گئے۔ اس کلب کی ممبری کے لئے یہ ضروری تھا کہ ممبروں چاہے جیسا بھی تیز طرار ہو۔ ذہین اور طباع ہو مگر اس میں سے لطیف کی کسی نہ کسی حیثیت سے کمی ضرور ہو۔ چنانچہ اس کلب میں ہمارے داخلہ کا قصہ یہ ہوا کہ ہم شام کے وقت بغیر روشنی کے بائیکل پر جا رہے تھے کہ راستہ میں ٹریفک پولیس کے ایک کانسٹیبل نے روک لیا اور ہم سے

بائیسکل رکھوالی اور کہا کہ آپ کسی شخص کو لائیں جو شناخت کر کے یہ بتائے کہ آپ نے نام اور پتہ صحیح لکھوایا ہے۔ ہم فوراً خان صاحب کے دفتر پہنچے اس لئے کہ ٹینس ختم کر کے یہ حضرات کچھ دیر غپ شب کیا کرتے تھے۔ اور ان سے اس حادثہ کا ذکر کیا۔ سب کے سب فوراً ہمارے ساتھ وہاں تک گئے مگر وہاں نہ بائیسکل تھی نہ کانسٹیبل۔ ہم سب بوجھا کانسٹیبل ڈیوٹی پر تھا یا گشت کر رہا تھا۔ ہم نے کہا کہ ہم کو پتہ نہیں البتہ اس نے ہم کو یہیں روک کر نام اور پتہ لکھا تھا۔ بلکہ وہ تو زردی میں نہ تھا۔ اب تو یہ حضرات بدو نکے۔ کو تو الی جا کر تحقیقات کی۔ مگر وہاں بھی پتہ نہ چلا۔ مجبوراً رپورٹ لکھوا دی اور دوسرے دن ہم اس کلب کے متفقہ طور پر ممبر بن گئے۔ بائیسکل پھر نہ مل سکی اور نہ اس کلب کی ممبری سے ہم علیحدہ ہو سکے۔ کلب کے باقی تمام ممبر بھی اسی قسم کے کسی نہ کسی واقعہ کے ماتحت ممبر بنے تھے۔ خود رفیع احمد خاں بھی ممبر تھے۔ اور خدا کے فضل سے ممبروں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اور کلب ترقی پر تھا۔ کہ کسی دفتری مصلحت کی بنا پر خان صاحب کو وہاں ٹینس ترک کرنا پڑی اور اسی سلسلہ میں کلب بھی ختم ہو گیا۔ مگر اس کے ممبر اب تک موجود ہیں۔ اور ان کی خصوصیات اب تک زندہ ہیں۔

## یوپی انڈسٹریل نائش

اسی زمانہ میں لکھنؤ میں ایک بہت بڑی نائش کے انتظامات شروع ہوئے تمام دکتوریہ پارک میں اس نائش کے مختلف شعبے پھیلا دیئے گئے۔ ہندوستان بھر کے ماہرین فن اس موقع پر لکھنؤ میں یکجا ہو گئے۔ بڑے بڑے پہلوان اور بڑے

بڑے ماہرین موسیقی۔ بڑے بڑے مصور اور بڑے بڑے دستکار، اسی سلسلہ میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کرنے کے انتظامات بھی شروع ہوئے اور خان بہادر سید عین الدین صاحب، ایم بی، ای، انسپکٹر جنرل جسٹس، یو پی کو اس کا سربراہ بنایا گیا۔ خان بہادر صاحب نے اپنے اسسٹنٹ جے۔ ایک خاکسار اور دوسرے مشیر احمد صاحب علوی۔ ہم دونوں نے پورے صوبہ کا دورہ کیا۔ شعراء سے وعدے لئے۔ نواب صاحب چھتاری سے مشاعرے کی صدارت کی استدعا کی۔ اور کیپٹن نواب جمشید علی خاں صاحب آف باغیت کو صدر مجلس استقبال بنایا۔ لکھنؤ میں ایسا ہنگامہ خیز مشاعرہ شاید ہی کوئی ہوا ہو۔ تمام اطراف ملک کے نامی شعراء موجود تھے۔ اور بیس بائیس ہزار سامعین کا مجمع تھا پہلی نشست میں حاضرین نے یہ مطالبہ کیا کہ باقاعدہ مشاعرہ شروع ہونے سے قبل چند مخصوص شعراء کو پڑھوا دیا جائے۔ اس مطالبہ کو پورا کر دیا گیا۔ مگر اب مسلسل یہ تقاضہ تھا کہ مشاعرہ ان ہی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ اور جس جس کو وہ چاہیں پڑھوائیں نتیجہ یہ ہوا کہ مشاعرہ میں کچھ ناگوار سی صورت پیدا ہو گئی۔ اور اس اجلاس کو چار بجے کے قریب ختم کر کے اعلان کر دیا گیا کہ دوسری نشست دوسرے دن بارہ بجے سے شروع ہوگی۔ یہ دوسری نشست اس قدر کامیاب تھی کہ آج بھی لوگ اس مشاعرہ کو یاد کرتے ہیں۔ مشاعرے کی اس کامیابی کے سلسلہ میں رائے صاحب برج بلیجہ کشور نے دو طلائی تمغے ایک مجھے اور ایک مشیر احمد صاحب علوی کو دیئے اور نمائش کے دربار میں مشیر احمد صاحب کو سندا اور مجھے طلائی تمغہ یو پی گورنمنٹ کی طرف سے دیا گیا۔



## ہندوستانی ایکادمی

یوپی کی ہندوستانی ایکادمی نے بھی یہ طے کیا کہ اپنا جلسہ اسی نائٹس میں رکھے، چنانچہ صوبہ کی اس مقتدر ادبی انجمن کے اس جلسہ میں ہم کو بھی ایک مزاحیہ مقالہ پڑھنے کے لیے ڈاکٹر تارا چند سکریٹری ہندوستانی ایکادمی نے مدعو کیا۔ ایکادمی کا یہ جلسہ شاعر کے وسیع پنڈال میں ہوا۔ اتنا بڑا پنڈال اور ملک میں محدود قسم کا ذوقِ ادب پھر نہ پالا تھا۔ یہاں بھی ہو گا کہ یہ جلسہ محض ادبی نہیں بلکہ علمی بھی ہو گا۔ لہذا نائٹس کے دوسرے تاشوں کو چھوڑ کر بھلا کون اس علم و ادب کی طرف متوجہ ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پنڈال کے ایک گوشہ میں دس پندرہ آدمی جلسہ کرنے بیٹھ گئے۔ مگر وہ دس پندرہ اس قدر بھاری بھر کم لوگ تھے کہ ان میں کا ہر شخص اپنے اقتدار اور اپنی اہمیت کے اعتبار سے بیوی بچہ بارس پادر سے کم کا نہ تھا۔ مثلاً سرتیج بہادر سپرو، سر سید لیاقت علی، مولانا عبد الماجد دریا بادی، مولانا سید سلیمان ندوی ڈاکٹر تارا چند وغیرہ۔ اسی مختصر جلسہ میں مگر ان ادبی پہاڑوں کے سامنے اس ذرہ بے مقدار نے بھی اپنا مقالہ پڑھا۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی ہر فقرہ پر توجہ افزائی فرماتے تھے۔ اور سر سپرو کے متعلق قاطعاً یا نہیں کہ وہ کیا کرتے تھے مگر اس جلسہ میں بھی سر سید لیاقت علی رہی بھوپال والے چچا لیاقت علی بنے بیٹھے تھے۔ یعنی آنکھوں سے شہین و آفریں کے بجائے شفقت برس رہی تھی۔

## سگ بازی

آپ نے مرغ بازی اور شیر بازی وغیرہ سنا ہو گا۔ مگر ہم کو ان میں سے تو کسی سے شوق کبھی نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ تنگ بازی میں بھی ہمیشہ کوڑے رہے۔ مگر اب سگ بازی سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ بکھنوں کی ناش میں جہاں اور چیزیں تھیں وہاں گرے ہاؤنڈز بھی تھے۔ اور کتوں کی یہ دوڑ بالکل گھوڑ دوڑ کے اصول پر ہوتی تھی۔ ناش کے ساتھ اس کے تمام کعبیل تماشے ختم ہو گئے۔ مگر کتوں کی دوڑ میں جاتے تھے بازیاں لگاتے تھے۔ اور اس شوق کے پیچھے تاش ٹک کو چھوڑ رکھا تھا۔ رفیع احمد خاں، عالمگیر، یوسف مرزا، اور نواب زادہ خلیل اللہ خاں گویا پورا لشکر ہوتا تھا ہمارے دوستوں کا۔ چنانچہ ہم بھی جالے لگے اور سب کے ساتھ بازیاں لگانے لگے۔ کبھی جیتے کبھی ہارے۔ مگر ایک مرتبہ تو کمال ہی ہو گیا۔ ایک کتے کے متعلق معلوم ہوا کہ یہ سجلی کی طرح اپنے تمام ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کر یقینی طور پر بس جیتے گا۔ ہم سب نے اس کتے پر واؤ لگا دیا۔ کتا واقعی برق بلا تھا۔ چھوٹے ہی جوتیر کی طرح چلا ہے تو باقی کتے اس کی گرد کو بھی نہ پاسکے تھوڑی دور تک تو وہ اسی طرح چلا آیا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ کھڑا ہو گیا۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک مرتبہ دم ہلائی پھر آپ بھی بھونکے اور پھر نہ جانے کیا طے کر کے واپس لوٹ گئے خیال تھا کہ دوسرے کتوں کو دور ہوا دیکھ کر شاید آپ پھر دوڑیں مگر آپ سیدھے اپنے جنگل میں چلے گئے اور ہم سب کا دیوانہ نکلا دیا۔ کتوں کی اس دوڑ کے سب سے بڑے ماہر عالمگیر تھے جس طرح وہ فہرین کے نہایت آسانی کے ساتھ ماہر ہو جایا کرتے ہیں۔ کتوں کے عام حالات ان کی آواز

ان کی نسلی کیفیت ان کے اطوار اور ان کے امراض سب پر آپ کو پورا عبور حاصل تھا جس وقت دکھائی کے لئے کتے سامنے لائے جاتے تھے آپ ان پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہی فوراً بتا دیا کرتے تھے کہ اس کتے میں شرافت کا کتنا خون ہے اور اس کتے کی تعلیمی حالت کس قدر ہے گرے ہاؤنڈ رینگ کا پورا ریکارڈ آپ کے پاس محفوظ تھا ہر روز ریس کی کتاب لے کر آپ تمام پرانے ریکارڈ کی گویا پوری اسٹڈی فرماتے تھے اور پھر ایک باقاعدہ اسکیم لے کر ریس میں جایا کرتے تھے کہ اس میں اتنے ٹکٹ خود ضرور خریدیں گے اتنے ٹکٹوں میں دوسروں کے شریک ہوں گے۔ اور احباب کو یہ مشورہ دیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم سب سے زیادہ جیت میں دی رہتے تھے۔ مگر ان کے مشوروں پر چلنا ہمارے امکان میں اس لئے نہ تھا کہ اصول کے ماتحت ممکن ہے کہ جیت تو جائیں مگر یہ احساس کہ ہم عالمگیر کے مشورے پر چلے ہیں مشکل سے پہنچنے دے گا۔ اس سلسلہ میں ایک اور تاریخی واقعہ یہ ہے کہ شروع سے آخر تک ہم ترین روپے ہائے ہوئے تھے۔ اور آخری دن جب اس ریس کو سرکاری طور پر ختم کیا جا رہا تھا بالکل آخری ریس میں ہم نے ایک ڈبل ٹوٹ کا ٹکٹ سب سے الگ ہو کر تنہا خریدا۔ اور وہی ٹکٹ جتنا اس میں ہم کو ترین روپے ہی ملے۔ بکھنؤ سے یہ ریس کلکتہ چلی گئی ہم لوگ تو صبر کر کے بیٹھے مگر عالمگیر کلکتہ تک تشریف لے گئے۔ آپ نے پالتو کتوں کو تو پیچھے پیچھے آتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ مگر کتے کے پیچھے کسی ان کے جانے کی یہ پہلی مثال گویا آپ نے قائم کی۔

## سودشی ریل کتابی صورت میں

۱۹۳۰ء میں سودشی ریل نامی جو مضمون لکھا تھا اس کی مانگ اب تک

بہت زیادہ تھی۔ حالانکہ وہ چھپن مرتبہ مختلف زبانوں کے مختلف رسالوں میں  
چھپ چکا تھا۔ مگر اب لوگوں نے مشورہ یہ دیا کہ اس کو علیحدہ کتابی صورت میں  
پیش کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اس کو از سر نو ذرا وسعت دے کر لکھا اور پہلے  
نزدیک جو خامیاں اس میں رہ گئی تھیں۔ ان کو دور کر دیا۔ اس کے انگریزی ترجمہ  
کو بہت تلاش کیا مگر کہیں نہ مل سکا۔ آخر رفیع احمد خاں نے اس کا انگریزی  
ترجمہ کیا۔ اور ہم نے اس ترجمہ کے ساتھ سودیشی ریل کو کتابی صورت میں پیش کر دیا  
ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری ڈپٹی ڈائریکٹر انفارمیشن گورنمنٹ آف انڈیا نے  
اس پر مقدمہ لکھا۔ اور ہم نے ریل کی مناسبت سے موجودہ ریلوے ممبر گورنمنٹ  
آف انڈیا آزر بیل چودھری سر محمد ظفر اللہ خاں کے نام اس کو مستون کر دیا۔ ایک  
ہزار کا یہ ایڈیشن بھی ناکافی ثابت ہوا۔ اور اب بھی لوگ سودیشی ریل کی تلاش  
کرتے ہیں۔ اور ان کو اس کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔ حدیبیہ کہ خود ہمارے پاس اس  
کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔

## روزنامہ حق

لکھنؤ سے عبدالرؤف صاحب عباسی کی ادارت میں ایک ہفتہ وار اخبار  
نکلا کرتا تھا جس کا نام تھا حق عبدالرؤف صاحب اور آپ کے برادر محترم علی اختر  
صاحب عباسی ہمارے لئے اجنبی نہ تھے۔ رفیع احمد خاں کے یہاں اس دونوں  
حضرات سے نیاز حاصل ہو چکا تھا۔ اور بار بار ملنے کے بعد ایک قسم کی  
بے تکلفی سی تھی۔ عبدالرؤف صاحب نے یہ طے کیا کہ اپنے اخبار کو

روزنامہ بتا دیں چنانچہ اس سلسلہ میں ایک دن ہم کو بھی یاد فرمایا مقصد یہ  
 تھا کہ ہم بھی ان کے مشورہ میں شریک ہو سکیں اخبار کی پوری اسکیم سننے کے  
 بعد ہم نے بھی کچھ مشورے دیئے اور ان کے ارشاد کی تعمیل میں ان سے وعدہ کر لیا  
 کہ مزاحیہ کالم جس کا عنوان ہم نے خود حق کی رعایت سے "حق و باطل" تجویز کیا  
 تھا لکھ دیا کریں گے۔ مگر وہ خود اور علی اختر صاحب عباسی اس بات پر مہر تھے  
 کہ ہم باقاعدہ ملازمت کی صورت میں حق کی اسسٹنٹ ایڈیٹری کی ذمہ داری  
 لے لیں ہم نے ان سے غور کرنے کے لئے وقت مانگا۔ اور پھر اپنے چند احباب سے مشورہ  
 کیا۔ زیادہ تر لوگوں کی ہی رائے تھی کہ ملازمت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر ہم نے  
 اپنے فیصلہ سے ان کو مطلع نہیں کیا۔ بلکہ دوسرے دن خود علی اختر صاحب کا خط  
 آیا کہ فوراً ابھارو اور اپنے اخبار میں کام شروع کر دو۔ بخواہ طے ہو چکی تھی ہم حق  
 کے دست پر پہنچ گئے۔ اور ملازمت قبول کر لی خبروں کا ترجمہ حق و باطل کا  
 لکھنا اور شذرات کا لکھنا وغیرہ ہمارے سپرد ہوا۔ اس کے علاوہ ہر روز  
 ایک قطعہ شاعر حق کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ عبدالرؤف صاحب عباسی اور  
 علی اختر صاحب عباسی کے علاوہ آپ کے والد محترم چوہدری رشید علی  
 صاحب عباسی نہایت محبت اور خلوص سے پیش آتے تھے۔ ہر وقت کے ناشتے  
 اور کھانے پر اگر ہم وہاں موجود ہیں تو نہایت اصرار کے ساتھ شریک  
 کئے جاتے تھے۔ پانوں سے ہر وقت تواضع ہوتی تھی۔ اور سچی بات تو یہ ہے  
 کہ ہمارے مد خیال کیا جاتا تھا کہ زیادہ سچا ہم کو ایک تکلیف بھی تھی۔ وہ یہ کہ  
 عبدالرؤف صاحب عباسی کے ایک چچا زاد بھائی بھی علمہ ادارت میں تھے اور

ان کا رویہ کچھ ایسا تھا کہ گویا ہم براہ راست انہی کے ملازم ہیں عجیب شعلہ مزاج اور  
 زیرِ فطرت پائی تھی۔ آپ نے زبان کے آگے خندق بھی تھا۔ دراصل ان کی یہی بات  
 ناگوار تھی کہ جو شخص ملازم ہے اس کے ساتھ عزیزانہ برتاؤ کیوں ہو رہا ہے خیر ان سے  
 ڈرنے کی تو کوئی وجہ نہ تھی۔ مگر ڈر معلوم ہوتا تھا۔ اس بات سے کہ کسی دن ان کی بات  
 پر نہ بڑھ جائے خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ عبدالرؤف صاحب عباسی اور  
 ان کے برادر محترم بھی ان کی ہر بات فوراً تسلیم کر لیتے تھے چنانچہ صرف وہی  
 بزرگ عبدالرؤف صاحب کے تعلقات بہت سے لوگوں سے خراب  
 کرا چکے تھے۔ اور آئے دن کسی نہ کسی سے لڑائی کراتے رہتے تھے ہم نے اس  
 تصادم سے بچنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ اور اپنی فطرت کے فلاح  
 کے لیے حد ضبط اور درگزر سے کام لیا۔ ورنہ وہ تو گویا ہر وقت تصادم  
 کے لیے تیار ہی تھے۔ دو سال تک اس تصادم سے بچے۔ مگر آخر کار وہی  
 حسرت اور ان کا وہی مزاج ہماری روزنامہ حق سے علیحدگی کا باعث  
 ہوا۔ اخیر یہ تو بعد کی بات ہے۔ فی الحال تو ہم کو روزنامہ حق کے سلسلہ کی  
 دوسری تفصیلات میں جانا ہے۔

## پنجاب کا دوسرا سیفر

روزنامہ حق کی ملازمت ہی کے درمیان ہم کو پھر قادیان جانا پڑا لکھنؤ  
 میں احمدیت کے خلاف جو پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ اسی سلسلہ میں مولوی محمد عثمان  
 صاحب احمدی نے حقیقت کے ایڈیٹر انیس احمد عباسی کو اور اس خاکسار

کو دعوت دی کہ آپ لوگ قادیان چل کر وہاں کے حالات کا خود مطالعہ کریں اور اپنے اس مطالعہ کی روشنی میں اگر مناسب سمجھیں تو کچھ لکھیں۔ انیس احمد صاحب عبا سی نے اور ہم نے علیحدہ مشورہ کیا۔ اور آخر اس دعوت کو منظور کر لیا۔ انیس صاحب کے ساتھ ریل کا سفر نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔ آپ کی سفری گھبراہٹیں اور اگر کوئی کسی سے کسی قسم کا مذاق کرے تو آپ کی سراسیمگی قابل دید ہوتی ہے اس تمام سفر میں آپ کو یہ انتظار رہا کہ کب اس شوکت کی وجہ سے کسی مسافر سے فوجداری ہوتی ہے۔ اور کب کسی مذاق کے سلسلہ میں شوکت کے ساتھ خود ان کی گت بنتی ہے۔ مگر شکر ہے کہ اس کی نوبت نہ آ سکی اور انیس احمد صاحب کی ٹوپی اچھلنے کا تو کیا ذکر ہے۔ ٹوپی اترنے تک موقع نہ آ سکا۔ البتہ رات کو حبيب وہیے خبر سو گئے تو خود ہم نے ٹوپی ذرا سی کھسکا کر دیکھی۔ کہ آخر سر میں کب تک نقص ہے کہ یہ ٹوپی کبھی اتارتے ہی نہیں مگر ہماری سمجھ میں کوئی بات نہ آ سکی اس مرتبہ قادیان پہنچ کر ہم لوگوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ ہر شعبہ کو تنقیدی نظر سے دیکھا۔ خود حضرت صاحب سے ملے۔ اور دعوت بھی ان کے ساتھ کھائی ہمارے اعزاز میں ایک مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا۔ اسکول کو دیکھا اور حضرت صاحب کی مکمل سکریٹریٹ کی میر کی۔ جہاں ہر ایک شعبہ کا علیحدہ ناظم تھا اور جتنے ناظم تھے وہ سب نہایت ایشار کے ساتھ اپنی اعلیٰ قابلیتوں کے باوجود نہایت قلیل معاوضہ پر کام کر رہے تھے۔ برادر محترم مولوی محمد عثمان صاحب نے ہم دونوں کی تواضع اور آرام کا ہر ممکن انتظام ہر جگہ کیا۔ اور آخر ہم سب ایک رائے قائم کر کے وہاں سے واپس ہوئے۔ انیس صاحب سیدھے لکھنؤ آ گئے اور مولوی محمد عثمان

صاحب اور ہم لاہور گئے اس مرتبہ بھی ہم لوگ لاہوری احباب سے ملے حکیم  
یوسف حسن صاحب اور ان کے رفیق کار سید فرید جعفری جو اس زمانہ میں نیرنگ  
خیال کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اپنے پر تکلف دسترخوان پر ہم کو ملے۔ سالک صاحب  
اور اسلم صاحب سے ملاقاتیں رہیں۔ سید امتیاز علی تاج سے ملے اور لاہور کی  
ان دوسری سیر کے بعد اپنے گولاہور کا اور بھی تشنہ بنا کر واپس آ گئے۔

## دوستانہ ملازمت

عبدالرؤف صاحب عباسی اور علی اختر صاحب عباسی سے دوستانہ تعلقات  
پہلے تھے۔ اور ملازمت بعد میں شروع کی تھی۔ ڈیرہ تھا کہ کہیں دوستی ختم نہ ہو جائے  
اور صرف خادم اور آقا کے تعلقات نہ رہ جائیں۔ مگر یہ صورت نہ ہو سکی۔ بلکہ  
دوستانہ تعلقات نے عزیزہ دارانہ تعلقات کی صورت اختیار کر لی یہی وجہ تھی کہ  
عباسی صاحب کے ان عزیز کا طرز عمل ناگوار ہوتا جاتا تھا۔ ورنہ حال تو یہ تھا  
کہ دفتر میں کام کے وقت بھی دوستانہ باتیں ہوتی رہتی تھیں اور بعد میں بھی ہم سب  
کے تفریحات مشترک تھیں۔ وہ اپنے وطن کا کوری جاسے ہیں اور بعد میں کہ شوکت  
بھی چلیں سینا جاسے ہیں اور ہم ساتھ ہیں کسی جلسہ میں جاسے ہیں اور ہمارے بغیر  
چلتے نہیں۔ مختصر یہ کہ نہایت خوشگوار مراسم تھے۔ آپ کے ایک اور عجیب الخلق  
عزیز اسی زمانہ میں تشریف لے آئے اور روزنامہ حق کے شعبہ انتظام میں بھڑا  
بہت کام کرنے لگے، یہ حضرت گویا ہم سب کے لئے عجیب تفریحی سامان تھے ان  
کے ساتھ ٹھہروں گے میں ہم سب برابر کے شریک ہوتے تھے۔ اور عباسی صاحب کے



والد محترم ہم سب کی شرارتوں کو بڑی پیار کی نظر سے دیکھا کرتے تھے یوں تو گویا  
بڑی ابھی طرح گذر رہی تھی۔ مگر جان پر ہم بھی کھیلے ہوئے تھے۔ وہ کس طرح اس کا  
اندازہ آنے والے ابواب سے ہو گا۔

## شب نے دن دار صبح خیز

ہم اس زمانہ میں پھر اپنے ذاتی مکان زر و کرکھی میں رہتے تھے۔ جو دکنٹوریہ  
اسٹریٹ پر تھا۔ اور روزنامہ حق کا دفتر ہیونٹ روڈ پر مقبول گنج میں تھا۔ یہاں  
تین میل سے کم نہ ہو گا۔ حق صبح تڑکے نکلتا تھا۔ اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ تمام مقامی  
اخبارات سے پہلے بازار میں پہنچ جائے چنانچہ اس کے خبروں کے ضخیمہ کو مرتب  
کرنے کے لئے ہم کو چار بجے صبح دفتر پہنچ جانا چاہئے تھا۔ صبح چار بجے دفتر پہنچنے  
کے لئے ہم رات کو تین بجے بیدار ہوتے تھے۔ اور زبردستی ضروریات سے فاسخ  
ہو کر بائیسکل پر دفتر جایا کرتے تھے۔ کوئی موسم ہو کیسے ہی حالات ہوں۔ مگر ہم کو  
اسی وقت چلنا پڑتا تھا۔ دسمبر کی شب سارے چیز سردی میں کان سے جس قسم  
کے مراسم ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ دسمبر کی کسی رات کو محسوس سے نکال کر  
کیجئے گا۔ مگر ہم کو اسی زمانہ میں سحان چھوڑنا پڑتا تھا۔ اور ساڑھے تین بجے کے  
قریب کانوں پر سفلیٹ کر اور شیروانی پر موٹا سا پستری پہن کر ہم دفتر جایا  
کرتے تھے۔ سڑکیں ویران ہوتی تھیں۔ اور راستہ میں ایک آدھ ایسی جگہ بھی ملتی تھی  
جہاں آسانی سے لوٹ مار ہو سکتی ہے۔ بلکہ جہاں اس قسم کا ایک آدھ واقعہ پہلے بھی  
ہو چکا تھا۔ مگر ہم کو اطمینان تھا کہ ہم سے کوئی کچھ نہ ہو جائے گا اور اگر ہو جائے تو

کہہ دیں گے کہ بھائی تم خود غور کرو کہ ایک ایسے شخص کے پاس تم کو کیا مل سکتا ہے۔ جو اپنی ضروریات سے اس قدر محبور ہو کہ اس وقت اور اس موسم میں کام پر جا رہا ہو

## ایک کتے نے مزاج پوچھ لیا

کسی آدمی نے تو خیر ہم سے اس قسم کا کوئی سوال نہیں کیا۔ مگر ایک رات جب ہم چسٹر میں پیٹے دستا نے چڑھائے۔ گلوبند میں چپے بائیسکل کے فسرانے بھرتے چلے جاسے تھے۔ ایک کتے نے ہم کو ٹوکا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ روز ہی کتے پوچھا کرتے تھے اور ہم رعیت کہہ کر نکل جایا کرتے تھے۔ مگر یہ کتا شاید بنیا بنیا تبدیل ہو کر آ یا تھا وہ رہا سے ہم کو دیکھ کر اس نے ٹوکن شروع کر دیا۔ مگر جب یہ دیکھا کہ شخص سرکشی سے کام لے رہا ہے اور کچھ نہیں مانتا۔ تو ایک مرتبہ چپٹ اس زور سے ہم کو گھسیٹا ہے کہ ہم معہ بائیسکل کے سڑک کے بچوں کیچ نہایت اطمینان سے استراحت فرما رہے تھے۔ اور کتا دور کھڑا ہوا اب تک ہم کو ڈانٹ رہا تھا۔ بمشکل تمام اس کو دہان سے بھگانا اور اب جو گوردو غیرہ جھاڑتے ہیں تو بہتہ چلا کہ چسٹر کا ایک دامن چسٹر سے نہ صرف علیحدہ ہے بلکہ اس کا ایک حصہ وہ کتا نوچ کر لے گیا ہے۔ اس روز سے ہم نے برابر اپنے ساتھ مارچ رکھنا شروع کر دی اس لئے کہ کتے بھگانے کے چند تجربہ کاروں میں سے ایک نسخہ مارچ بھی ہے۔

## ہماری کشش

آخر کار ہماری کشش نے دفتر کو اپنی طرف کھینچا اور روزنامہ حق کا دفتر

ہیوٹ روڈ سے منتقل ہو کر گورنمنٹ اکیڈمی ہاں ایک نہایت وسیع محل مرشد آباد پلس  
میں دفتر کے علاوہ اپنی رہائش اور پریس کا عبدالرزاق صاحب نے معقول انتظام کر لیا  
اب گویا یہ جگہ ہمارے گھر سے بقدر نصف میل قریب ہو گئی۔ مگر رات کو اسی وقت اب بھی  
جاگنا پڑتا تھا۔ اور دفتر اب بھی اسی وقت پہنچتے تھے۔ البتہ سائیکل پر چند پیر کم مارنا  
پڑتے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے اعزہ کے علاوہ یہ بات خود ہماری سمجھ میں کبھی نہ آئی کہ  
یہ پابندی ہم سے کیونکر ہو گئی۔ یہی ہم تھے کہ روزانہ صبح تڑا کے یعنی دس بجے سو کر اٹھا کرتے  
تھے۔ آفتاب طلوع بھی ہوا کرتا ہے۔ اس کی ہم کو کوئی اطلاع نہ تھی۔ ناشتہ ہمارے بستر کے  
قریب صبح سے دس بجے تک پڑا سوکھا کرتا تھا۔ اور ہمارے نزدیک صبح کا سہانا وقت یہی  
دس بجے دوپہر کا وقت ہوتا تھا۔ مگر اب گویا ایک سرے سے سوتے ہی نہ تھے رات کو  
گیارہ بجے دوستوں سے فرصت پا کر آتے۔ اور صبح ہونے سے دو گھنٹے پہلے ہی بستر چھوڑ دیا  
سوال تو یہ تھا کہ ہم بستر چھوڑ ہی کیسے دیتے اور بستر ہم کو کیونکر چھوڑ دیتا تھا۔ والد  
صاحبہ کو ہماری اس ملازمت سے نہایت شدید اختلاف محض اسی وجہ سے تھا  
اور باقی لوگ بھی یہی کہتے تھے کہ صاحب یہ ان ہی کا کام ہے کہ اس وقت اس  
طرح دفتر جاتے ہیں۔

## رسالہ کائنات

عبدالرزاق صاحب عباسی نے اس نئے مکان میں آنے کے کچھ دن بعد طے  
کیا کہ ایک ادبی ماہنامہ بھی نکالا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی طے کیا کہ اس کی  
ادارت کی پوری ذمہ داری ہمارے سر رہے گی۔ چنانچہ اس کا نام "کائنات"

تجویز ہوا۔ سرورق پر ایڈیٹر کی حیثیت سے ہمارا اور اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ان ہی آدم بیزار عزیز کا نام دیا گیا۔ رسالہ کے لئے ہم نے اپنے اثر سے کام لیکر خاص خاص لوگوں کے پیغامات منگائے۔ ملک کے مقتدر ادیبوں کے مضامین جمع کئے اور پہلا نمبر اس قدر شاندار پیش کیا کہ جو دیکھتا تھا داد دیتے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اس رسالہ کو ترقی دینے کے لئے ہم نے عبدالرزاق صاحب عباسی کی اجازت سے کچھ سربایہ جمع کرنے کا بیڑہ بھی اٹھایا۔ مگر سوائے ایک رقم کے جو نواب بہادر سر محمد منزل اللہ خاں صاحب سے حاصل کر سیکے اور کوئی بڑی رقم ہم کو حاصل نہ ہوئی۔ البتہ وہی تین پرچوں کے بعد اس کے خریداروں کی تعداد کافی پیدا ہو گئی اور رسالہ نے مقبولیت حاصل کرنا شروع کر دی۔ مگر ایک طرف تو روزانہ اخبار کی مصروفیات، دوسری طرف ایک سلسلہ جو خود پورا وقت اور پوری توجہ چاہتا تھا، آخر پانچ یا چھ نمبروں کے بعد یہ گاڑی آگے نہ چل سکی۔ اور عبدالرزاق صاحب نے اس کو بند کر دیا حالانکہ اس کے بند ہونے کے بعد بھی اس کی مانگ برابر جاری رہی اور اس کے اس قدر جلد سمجھ ہو جانے کو عام طور پر تکلیف کے ساتھ محسوس کیا گیا۔

## مولانا عبدالمجید دریابادی

کائنات ہی کے سلسلہ میں حضرت مولانا عبدالمجید دریابادی سے بھی تہذیبِ مراسم کی نوبت آئی۔ مولانا کے اور حضرت نیاز فتحپوری ایڈیٹر رسالہ نگار کے درمیان نگار کی مذہبی تحریروں کے سلسلہ میں ایک تاریخی اختلاف رہ چکا تھا۔

جس نے ایک زمانہ میں اچھے خاصے معرکہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اور مولانا  
 دریا باوی نے نگار کے خلاف جہاد شروع کر دیا تھا۔ لکھنؤ میں اس سلسلہ میں  
 جلسے ہوئے فرنگی محل میں علمائے کرام نے نگار کے خلاف علمی جدوجہد کا بیڑہ  
 اٹھایا۔ امین الدولہ پارک میں ایک جلسہ عام ہوا اور آخر کار نگار کے خلاف متفقہ  
 طور پر یہ طے کر دیا گیا کہ نگار کی محدانہ روش کو جاری رہنے دینا غیرت اسلامی  
 کے لیے ناقابل برداشت ہے ہم لوگوں نے نیاز صاحب مفتی پوری کو اس  
 حد تک راضی کر دیا تھا کہ وہ نگار کی پالیسی بدل دیں۔ ایک ادبی رسالہ کو محض  
 ادبی نہ رہے دیں۔ اگر ان کے ذاتی عقائد وہاں ہیں۔ جن کا وہ نگار کے ذریعہ  
 تبلیغ کر رہے ہیں۔ تو بھی ان کو اپنی ذات تک محدود رہنے دین۔ وہ صورت  
 اختیار نہ کریں جس سے عام مسلمانوں میں نگار کے لیے نفرت اور غصہ کے آثار پیدا  
 ہوں۔ جب نیاز صاحب ہم لوگوں کے اس مشورہ پر راضی ہو گئے تو ہم  
 نے جلسہ عام میں جو ان ہی کے خلاف پورا ہوا تھا۔ اپنی ذمہ داری پر یہ اعلان  
 کیا کہ ہم نیاز صاحب کی طرف سے یہ یقین دلاتے ہیں کہ نگار میں اس قسم کا لڑکچہ  
 آئندہ پیش نہ ہو گا۔ مگر اس موقع پر بعض حضرات نے نہایت اشتعال انگیز تقریریں  
 کیں اور مطالبہ یہ کیا گیا کہ نیاز صاحب چونکہ عام مسلمانوں کے مجرم ہیں۔ لہذا  
 ان کو اسی جلسہ میں آکر سب کے سامنے غیر مشروط طور پر معذرت خواہ ہونا چاہئے  
 اس کی مخالفت ہم نے بھی کی۔ اور اس کو یانیاں جلسہ کی زیادتی قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا  
 کہ یہ کشمکش جاری رہی۔ جو اعلیٰ صورت اس وقت پیدا ہو رہی تھی وہ بھی نہ  
 ہو سکی۔ اور محض اس تشدد کی وجہ سے اس کشمکش کا سد باب نہ ہو سکا۔ اسی زمانہ

میں حضرت مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی نے ہم کو بھی "تیا زمندوں" میں  
 شامل سمجھ کر نہ معلوم کیا رائے قائم کر لی تھی۔ اور ان کے تمام اسکول کی رائے ہمارے  
 لئے غالباً یہی تھی کہ یہ بھی ایک بہکا ہوا مسلمان ہے مگر اب قسریہ سے دیکھ کر  
 کچھ بڑھ کر اور کچھ سمجھ کر آپ نے اپنی رائے میں غالباً کچھ ترمیم سر مائی اور  
 پھر نہایت شفقت سے ملنے لگے۔ رسالہ کائنات کی قلمی اعانت فرماتے رہے تاکہ  
 شوکت کی ہر اعانت کے لئے تیار ہو گئے۔

## مشاعرہ کائنات

اسی زمانہ میں عبدالرکون صاحب عباسی کی رائے سے ہم نے ایک  
 مشاعرہ منعقد کیا۔ طرح تھی ۶

تم ہو جس کے ہے اسی کی کائنات

حضرت مولانا عبد الماجد دریا بادی سے اس کی صدارت کی درخواست  
 کی۔ اب تو آپ شوکت کی ہر بات مان لیا کرتے تھے یہ درخواست بھی منظور  
 ہو گئی۔ اور آپ نے مشاعرہ کی صدارت کرتے ہوئے ایک نہایت دلچسپ  
 جامع اور پر مغز خطبہ صدارت بھی ارشاد فرمایا۔ جس کا وہ حصہ جو اس خاکسار  
 کے متعلق تھا خصوصیت کے ساتھ بے حد دلچسپ تھا ملاحظہ ہو :-

”بزم مشاعرہ اور وہ بھی لکھنؤ میں اور اس کا

صدر ایک دیہاتی اور دیہاتی بھی کیسا زبان وادب

کے شعبہ میں بالکل مبتدی اور شعر و سخن کے باب

میں محض غبی، داد بانی، مشاعرہ کی خوش طبعی  
 کی دیکھیے۔ سبحان اللہ کیا خوب نظر انتخاب پر مکی  
 ہے۔ ان کی علمی طرافت سب پر روشن و آشکار  
 لیکن حقیقت میں آج کی علمی طرافت ان کا شمار  
 دنیا کی نظر میں وہ محض ظریف۔ لیکن آج کے صدر  
 مشاعرہ کے حق میں ستم ظریف! یہ صدارت کیا ہو  
 تحفہ الرجال۔ بلکہ نیرنگی و ہر کا ایک کھلا ہوا  
 نشان۔ اور ایسی عجیب حقیقت کہ اس پر افسانے  
 کا گمان۔ بلکہ یوں کہے کہ فسانہ عجائب کا کوئی  
 طریقہ ایڈیشن اگر صاحب کائنات کی سرپرستی  
 میں زیر طبع ہو تو اس کے لئے موزوں عنوان!

اس خطبہ کے بعد اس خاکسار نے اپنی ایک غیر طرعی غزل سے مشاعرہ کا آغاز  
 کیا۔ اس غزل میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

وہ اس غریب نے پایا نہیں مقدر سے  
 سر نیاز کے قابل جو آستانہ تھا

مولانا نے تبسم فرمایا۔ اور دوبار اس شعر کو پڑھوایا اب ہم سمجھے کہ مولانا اس  
 شعر کو کہاں سے کرپہوئے اور واقعی یہ شعر تو معرکہ و گارڈ پر پڑی اچھی روشنی ڈال  
 رہا تھا۔ ہم بھی سمجھ کر مسکرائے اور مسکراہٹوں کے اس تبادلے سے ہم دونوں نے  
 ایک دوسرے کو کچھ بتا دیا کچھ سمجھا دیا اور کچھ سمجھ گئے۔

## شکست تھانوی مراد

جماعت احمدیہ کی طرف سے ہر سال جلسہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہوا کرتا تھا اور ہر جلسہ میں ہم ایک نظم پڑھا کرتے تھے۔ مسلسل چار سال تک ہم نے جلسہ میں نظمیں پڑھی تھیں اور اب تک اس جلسہ میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہ تھا مگر ہم تو بڑے مبارک قدم واقع ہی ہوئے ہیں۔ جہاں اور جس معاملہ میں ہمارا دخل ہو جائے۔ پھر خیریت ذرا مشکل ہی سے نظر آتی ہے۔ چنانچہ جس جلسہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کے لئے صدر ہم کو منتخب کیا گیا تھا۔ اور کھنور میں اس جلسہ کے خلاف پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ کہ یہ "قاویانی" جلسہ سیرۃ النبی صلعم کے پرے میں دراصل اپنی تبلیغ کرتے ہیں۔ اور ان کی "چالاکیوں" کو مسلمان سمجھتے نہیں بلکہ اس دھوکے میں چلے جاتے ہیں کہ یہ جلسہ سیرۃ ہے۔ مگر ہم پر اس پروپیگنڈے کا کوئی اثر نہ تھا ہمارے پاس بھی لوگ آئے اور ہم کو منع کیا مگر ہم اپنی رائے پر قائم رہے کہ یہ ذکر رسولؐ ہے اور ذکر رسولؐ خواہ کسی جماعت کی طرف سے بھی ہو ہر مسلمان کے لئے باعث کشف ہونا چاہئے۔ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر اب اس اختلاف کی کیا وجہ پیدا ہو گئی۔ اب سے پہلے ہر سال بڑے بڑے غیر احمدی علماء نے اس جلسہ میں شرکت کی تھی بغیر مسلم مقرر اس میں حضور سرورِ دو عالم صلعم کی زندگی پر اپنے خیالات پیش کرتے تھے۔ بشیہ اور سنی علماء ہر مرتبہ شریک رہتے تھے مگر اب اس جلسہ کو یکا یک احمدی حضرات کا ایک "وائرل" سمجھ لیا گیا تھا بہر صورت ہم نے کسی کی ایک نہ سنی اور جلسہ کی صدارت



کرتے مقررہ وقت پر گنگا پر شاو موریل ہال پہنچ گئے۔ اس وقت بھی ہال کے دروازہ پر ایک قسم کی پکٹنگ ہو رہی تھی۔ لوگوں کو جلسہ کی شرکت سے روکا جانا تھا۔ مگر اس کے باوجود جلسہ میں حاضرین کی تعداد کافی تھی۔ ہم نے ایک مختصر سے خطبہ صدارت کے بعد جلسہ کی کارروائی شروع کر دی۔ مگر حاضرین جلسہ میں بہت سے حضرات اسی غرض سے آئے تھے کہ جلسہ میں ابتری پیدا کریں۔ چنانچہ ہال کے اندر ہی کچھ لوگوں نے شور و غل شروع کر دیا۔ ہم نے ایک مختصر تقریر میں پھر لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کی کہ آپ حضرات سینما ہاؤس میں خاموش بیٹھ سکتے ہیں اور تماشہ کے اختتام پر ”خدا بادشاہ کو سلامت رکھے“ والا ترانہ نہایت ادب سے کھڑے ہو کر سنتے ہیں۔ مگر یہاں اس وقت شہنشاہ دُعا ذکر ہو رہا ہے اور آپ اس کو خود سنتا تو درکنار دوسروں کو بھی سننے دینا نہیں چاہتے۔ فرمن کر لیجئے کہ یہ جلسہ احمدیوں کا ہے۔ مگر ذکر کن کا ہو رہا ہے جن کے نام لیوا آپ بھی ہیں اور رویہ آپ نے یہ اختیار کیا ہے گویا احمدیوں کی ضد میں آپ ان سے بھی بغاوت کر رہے ہیں۔ جو آپ کے ہیں مگر ان الفاظ کا بھی بہت کم لوگوں پر اثر ہوا اس لئے وہ تو گھر ہی سے طے کر کے آئے تھے کہ جلسہ میں ابتری پیدا کریں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں جلسہ کے باہر بہت کافی جمع ہو گیا۔ اور لوگوں نے نعرے بلند کرنا شروع کر دیئے جو جماعت احمدیہ کے خلاف تھے۔ مگر اس کے باوجود جلسہ کی کارروائی جاری رہی۔ مگر باہر کے شور و غل کا اثر اب ہال کے اندر بھی پہنچنے لگا۔ آخر حاضرین جلسہ میں سے ایک بزرگ نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں جناب صدر سے استعفا کروں گا کہ وہ جلسہ کی کارروائی ختم کر دیں۔ اس لئے کہ ہم کو ذکر حبیب سننے

کے لیے جس سکون کی ضرورت ہے۔ وہ یہاں حاصل نہیں ہو رہا ہے اس آواز کی  
 تائید اور لوگوں نے بھی کی۔ اور اسی وقت باہر سے پھر ایک طوفان اٹھا، اب جو نعرے  
 بلند ہو رہے تھے۔ وہ اس خاکسار کے متعلق تھے۔ یعنی ”شوکت تھانوی مردہ باد“  
 اور دھڑپے کچھ لوگوں نے نعرہ بلند کیا۔ ”شوکت تھانوی زندہ باد“ اور ہم حیران تھے کہ ہم  
 ان دونوں میں سے کس کے مشورہ پر عمل کرنا چاہئے۔ لوگوں نے ہم کو مشورہ دیا کہ آپ  
 پشت کے دروازے سے نکل جائیے۔ مگر ہم نے اس کو منظور نہ کیا اور اس وقت  
 اپنے دل میں بلا کی جرأت پیدا کر کے ہم صدر دروازہ ہی سے باہر نکلے جہاں  
 دور وہ لوگوں کی ایک بہت بڑی بھیڑ تھی اسے خلاف نعرے بلند کر رہی تھی۔ مگر  
 ہمارے پہنچنے ہی پھر دو قسم کے نعرے شروع ہو گئے، ”شوکت تھانوی مردہ باد“  
 اور ”شوکت تھانوی زندہ باد“ اور ہم اسی طوفان سے گذر کر سواری تک آئے  
 بانیان جلسہ نے اسی درمیان پولس کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ مگر ہم نے باہر نکل کر  
 پولس کو اپنی حفاظت سے روکا۔ اور یہ کہہ کر اس مجمع سے گزرنے لگے کہ میرا فیصلہ  
 ان ہی حضرات کو کرانے دیجئے۔ ایک صاحبزادے کچھ حملہ کرنے کے ارادے  
 سے آگے بڑھے تھے کہ ان ہی کے چند ساتھیوں نے ان کو روکا۔ اور ہم بخیریت مجمع  
 سے گذر کر اپنے گھر آ گئے۔ گھر پر اس ہنگامے کی اطلاع پہنچ چکی تھی اور سب  
 بے حد پریشان تھے۔ مگر ہم نے گھر جا کر سب کو مطمئن کر دیا کہ دیکھ لو میرے  
 دھڑپہ میرا سر موجود ہے، اور میرے تمام اعضاء صحیح سالم ہیں۔

## احمدی

اس سے قبل بھی اس بات کی شہرت تھی کہ شوکت تھانوی قادیانی ہے

دہریہ تھی کہ برادران محترم ڈاکٹر محمد عمر صاحب مولوی محمد عثمان صاحب ڈاکٹر  
 محمد ذبیر صاحب اور مولوی محمد طلحہ ایڈووکیٹ احمدی عقائد رکھتے ہیں۔ اور  
 ان ہی کی حقیقی بھتیجی سقیدہ ہیں۔ چنانچہ یہ عام طور پر خیال تھا کہ ایک احمدی لڑکی  
 غیر احمدی کے نکاح میں نہ آئی ہوگی۔ اس لئے کہ احمدی حضرات غیر احمدی لڑکی بیاہ  
 تو لاتے ہیں مگر غیر احمدی کو دیتے نہیں۔ اس کے علاوہ اب تک دومرتبہ قادیان  
 جا چکے تھے۔ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب سے مل چکے تھے۔ ان کے یہاں  
 دعوت کھا چکے تھے۔ بعض احمدی مسائل پر مضامین لکھ چکے تھے۔ ان تمام حالات  
 کے ماتحت ہمارے احمدی ہونے کی جو خبر گرم تھی اس کو بلاوجہ نو نہیں کہا جاسکتا۔  
 خواہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ مگر اس جلسہ کے بعد تو اس روایت پر گویا تصدیق  
 کی ہر بھی لگ گئی۔ اور اب ہمارے احمدی ہونے کا ان سب کو بھی یقین ہو گیا۔ جواب  
 تک مشکوک تھے۔ ہم سے جس کسی نے بھی پوچھا ہم نے یہی جواب دے دیا کہ حضرت  
 مسیح پوچھئے تو احمدی ہم آپ سب ہی ہیں۔ احمد ہمارے رسول برحق کا اسم پاک  
 تھا اور ان سے نسبت دینا ہم اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے ہیں رہ گیا آپ کا یہ  
 خیال کہ ہم مرزا غلام احمد صاحب کو مسیح موعود مانتے ہیں یا نہیں اس کے متعلق  
 ہم نے آج تک غور ہی نہیں کیا ہے۔ البتہ احمدی حضرات کے اسلامی جوش ان کے  
 اسلامی اصولوں پر سختی سے کاربند ہونے اور تبلیغ و اشاعت اسلام کے سلسلہ  
 میں ان کی دیوانہ وار سرگرمیوں کو ہم بیشک نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھتے  
 ہیں۔ مگر اس کے باوجود لوگ یہی کہتے رہے کہ صاحب یہ کیونکر ممکن ہے کہ شوقیت  
 قادیانی نہ ہوں۔ اور سر ظفر اللہ خان ان کے دیوان پر گول میز کانفرنس کے اجلاس

کی مصروفیتوں کے باوجود لندن میں بیٹھ کر تبصرہ لکھیں۔ خلیفہ صاحب قادریان  
 اپنے خطبہ جمعہ میں ان کی سو و پستی ریل کا ذکر کریں۔ اور قادریانوں کا اخبار الفضل ان  
 کا ذکر اپنے کالموں میں کرے۔ مگر ہم نے اپنی احمدیت کی اس شہرت پر سنجیدگی  
 کے ساتھ کبھی غور نہیں کیا اس لئے کہ اول تو ہم مذہبی آدمی نہیں ہیں، دوسرے  
 اگر مذہبی آدمی ہوتے تو مذہب کے معاملہ میں خدا کو یقین دلانے کی کوشش کرتے  
 نہ کہ اس کے بندوں کو، مذہب تو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایک راستہ  
 کا نام ہے۔ یہ کوئی سوسائٹی کی چیز نہیں۔

## روزناحق سے علیحدگی

آخر وہی خطرہ سامنے آیا۔ حق کے مالک و مدیر عبدالرؤف صاحب عباسی  
 ان کے براہر محترم علی اختر صاحب عباسی اور ان کے والد محترم مولوی رشید  
 علی صاحب کی تمام محبتوں اور تمام مدارات کے باوجود ان حضرات کے قریب  
 عزیز سے ہم کو اندیشہ تھا۔ وہی اپنی تمام مخالفتوں کے ساتھ اب بالا اعلان سامنے  
 آگئے۔ اب عبدالرؤف عباسی کے لئے ایک دوست اور ایک عزیز کا معاملہ تھا (اگر  
 مائے مائے پانی جدا نہیں ہوتا۔ بلکہ گھٹنے پیٹ ہی طرف جھکتے ہیں۔ ہم اگر یہ مطالبہ  
 کرتے کہ ہم دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر لیا جائے تو غلط ہوتا۔ لہذا ہم نے  
 اپنی شکایت کے ساتھ استعفا پیش کر دیا۔ حق کی ملازمت کے زمانہ میں جو محنت  
 ہم نے کی تھی۔ اور جس خلوص سے کام کیا تھا۔ اس کے پیش نظر ہم کو ایک وہم بھی  
 تھا کہ ہم نے بھی تھوڑا بہت استحقاق پیدا کر لیا ہے۔ اور حق کے حق داروں میں

ہم بھی ہیں۔ مالی حیثیت سے نہ سہی۔ اخلاقی حیثیت سے سہی کم سے کم اتنا حق تو ہمارا بھی تھا کہ ہمارے اس استغنے پر ہمدردانہ غور کیا جاتا مگر بجائے اس کے ہوا یہ کہ عبدالرؤف صاحب عباسی نے ایک دم اپنی نظریں ایسی پھیر لیں کہ گویا کبھی ہمارا سم قحط بھی نہیں لہندا ہم لے اپنے باقی مطالبات سے بھی ہاتھ اٹھائے اور بجائے اس کے رہے سہے تعلقاً کو بھی ختم کر دیا جاتا۔ ہم نے ملازمت ہی کو ختم کر دیا۔

## رفیع احمد خان کی مداخلت

ہماری اس علیحدگی کی خبر سن کر رفیع احمد خان نے بغیر ہمارے مشورے کے مداخلت کی اور عبدالرؤف صاحب عباسی کو سمجھایا کہ شوکت کو واپس بلانا چاہئے مگر ان کو جواب یہ ملا کہ "خان صاحب آپ دیکھتے رہئے وہ حضرت ادھر ادھر چھک کر غور آئیں گے۔ کون دیئے دیتا ہے چالیس روپیہ ماہوار کی ملازمت، خان صاحب کو یہ جواب ناگوار ہوا اور وہ پہلے تو پی گئے۔ مگر کچھ دن بعد ہم کو بتایا کہ میں نے صلح صفائی کی کوشش کر کے یہ جواب سنا تھا۔ ہم نے خان صاحب سے کہا آپ اسی کے مستحق تھے۔ خان صاحب ہمیشہ ہی کہا کرتے تھے کہ مجھ کو دنیا میں جتن چاہئے۔ باتوں پر حیرت ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شوکت "حق" میں کیونکر ملازم ہیں۔ اور یہ ملازمت کیونکر نبھتی چلی جا رہی ہے۔ عبدالرؤف صاحب عباسی کے اس آخری طرز عمل اور رفیع احمد خان نے ان کے جو الفاظ ہم کو پہونچائے تھے ان کی کچھ دنوں تک تو ہم کو شدید تکلیف رہی۔ مگر رفتہ رفتہ ہم ان تمام باتوں کو بھول گئے اور عبدالرؤف صاحب عباسی اور ان کے تمام خاندان سے پھر دوستانہ تعلقاً

قائم ہو گئے۔ جو آج تک موجود ہیں۔ یہ ہے کہ جن حضرات کی وجہ سے ہم کو ترقی سے دست بردار ہونا پڑا۔ ان کے ساتھ بھی ہم نے کوئی دشمنی کا خیال اپنے ذہن میں کبھی نہ لے کر دیا اس لئے ہم کو یقین تھا اور ہے کہ وہ حضرت ہمارے ساتھ تو کیا خود عبدالرؤف صاحب عباسی نے ساتھ کوئی دوستی نہیں کر رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے نقصانات کے علاوہ جو ان کی وجہ سے عبدالرؤف صاحب عباسی کی ہر و عزیزی کو برابر پہنچتے رہتے ہیں، کوئی نہایت شدید قسم کا نقصان ضرور پہنچے گا۔ اور آج نہ سہی کل سہی۔ عبدالرؤف صاحب کو قاتل ہونا پڑے گا۔ کہ ان کے یہ عم زاد برادر عزیزان کے راستے میں کس قسم کے کانٹے بوجھ گئے ہیں

## خان بہادر سید عین الدین صاحب

خان بہادر سید عین الدین صاحب ادیب، ای، موجود دیوان ریاست ہمارے ان بزرگوں میں سے ہیں جن کو اس خاکسار کے ساتھ "لہتی خلوص" ہے۔ ۱۔ اپنے جب یہ سن کر شوکت ان حالات کے "ماتحت حق" سے علیحدہ ہو گیا ہے تو فوراً ہم کو طلب کیا۔ اور نہایت جوش فرمایا کہ آخر تم اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہو۔ اخبار خود کیوں نہیں نکالتے۔ عرش کیا کہ اللہ کا دیبا یوں تو سب کچھ ہے صرف رد یہ پیسے کی ذرا کمی ہے۔ کہنے لگے اس کا انتظام میں کروں گا، ایک اچھے روزانہ اخبار کی اسکیم بنا کر مجھے دو۔ اور شیر احمد صاحب تلوی کو ہدایت کی کہ شوکت کے سر پر سوار ہو کر اسکیم فوراً مرتب کرالو۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ یہ پھر ملازم

کے پھر میں پڑیں۔ چنانچہ ہم نے ایک اسکیم مرتب کی اور خان بہادر صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ دوسرے ہی دن سے خان بہادر صاحب نے اپنے نہایت قیمتی وقت کا ایک حصہ اس کام کے لئے وقف کر دیا۔ موٹر پر اڑھسہ بجائے ہیں اُدھر جا رہے ہیں۔ ان راجہ صاحب سے ملے۔ ان کا تعلق دار صاحب سے کہا اور کہنا کیا وہاں تو نادر شاہی حکم ہوتا تھا کہ آپ اتنا روپیہ شہر گشت کو یا مجھے دے دیجئے۔ نتیجہ یہ کہ جلد ہی دن میں اتنا سرمایہ ہمارے لئے جمع کر دیا کہ اخبار نکالا جاسکتا تھا۔ راجہ صاحبان اور تعلقہ دار صاحبان نے یہ طے کیا کہ یہ اخبار ان کی پارٹی کا آرگن ہوگا۔ خاں بہادر صاحب نے فرمایا اچھا یہی سہی۔ مگر اخبار نکلتا بھی ایسا چاہئے جو اس پارٹی کے نمایاں شان ہو۔ سکھنڈ میں یہ گشت کرنے کے بعد خان بہادر صاحب دورے پر روانہ ہو گئے۔ اور ہم کو ہمارے کام کے لئے علی گڑھ طلب کیا گیا۔ علی گڑھ میں نواب بہادر محمد منزل اللہ خاں سے ایک گزراں قدر عطیہ دلایا اور ہم سے چند دوسرے رُوسا کو بھی ملوایا کہ ان حضرات سے بھی ضرورت کے وقت مدد لیتے رہنا۔ خان بہادر صاحب کی اس غیر معمولی توجہ نے ہمارے ذاتی روزنامہ کی داغ بیل آخر کار ڈال ہی دی :-

## طوفان اور اس کا دفتر

روزنامہ کا نام ”طوفان“ طے پایا چودھری خلیق الزماں صاحب نے ”ہنگامہ“ سے بچو نہ کیا تھا۔ مگر اکثریت کی رائے طوفان کے حق میں رہی لاٹوش روڈ

پیر ایک معقول مکان دفتر کے قیام اور ہمارے رہنے کے لئے کرایہ پر لیا گیا۔ طوفان کا زبردست سائن بورڈ لگایا گیا۔ اور دفتر کے ابتدائی انتظامات شروع کر دیئے۔ ہماری مندرجہ ذیل خالہ بیگم صاحبہ خان بہادر شیخ احمد علی صاحب کی مامنتا اس موقع پر آڈے آئی آپ نے ہمارے دفتر کے لئے تمام فرنیچر اپنی طرف سے دیا۔ اور اس طرح ہماری ذاتی زندگی کی بنیاد میں خان بہادر سید عین الدین صاحب کے ساتھ ہی ایک پتھر ان محترمہ نے بھی رکھ دیا۔ ہم نے اپنا عملہ منتخب کیا، خان محبوب طرزی کو اپنا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنایا۔ اس لئے کہ آپ ہمارے ساتھ سرچ کے علاوہ اور وہ اخبار میں بھی رہے تھے، روزنامہ مہم میں بھی ہم نے آپ کو بلا لیا۔ اور اب طوفان کے اجراء کے وقت ہم کو آپ سے زیادہ مناسب معاون کوئی اور نہ مل سکتا تھا براہِ رم امین سلو نوی کی انڈی پینڈنٹ بیوز سروس کی خدمت ہمارے لئے موجود تھی نسیم صاحب کے انتظامی مشمولے ہم کو حاصل ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ ان سب نے مل کر چھپڑاٹھایا۔

## نمونے کا پرچہ

تمام ابتدائی انتظامات کی تکمیل کے بعد، اربع الاول ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۱ مئی ۱۹۳۵ء کو ہم نے طوفان کا نمونہ کا پرچہ نکالا اور اعلان کر دیا کہ اس کی باقاعدہ اشاعت یکم جون سے شروع ہوگی۔ بیس دن کا یہ وقفہ اشتہارات حاصل کرنے خریدار فراہم کرنے، ایجنسیاں قائم کرنے اور دوسرے تمام انتظامات کو مکمل کرنے میں صرف کر دیئے اور آخر یکم جون کو باقاعدہ اشاعت شروع ہو گئی اتفاقاً



سے اسی زمانہ میں زمیندار کا فرانس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ مہاراجہ درجہ گھڑ  
 اور مہاراجہ صاحب جہانگیر! و صدر مجلس استقبالیہ تھے۔ تعلقہ داران اودھ  
 کی طرف سے طوفان کی کوئی خاص اعانت تو نہ ہوئی تھی مگر وہ اس کو اپنا ہی اخبار  
 سمجھتے تھے۔ اور کانگریس کی کسان سدھار تحریک سے خائف ہو کر اپنی تنظیم کی  
 طرف متوجہ ہو گئے تھے کہ ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ان کی شکار گاہ میں  
 کانگریس شکار کھیلنا نہ شروع کر دے۔ طوفان نے زمینداروں کی ہر ممکن کالبت  
 کی۔ مگر اس کا کوئی صلہ طوفان کو نہ مل سکا۔ جن تعلقہ داروں نے انفرادی حیثیت  
 سے امداد کی تھی وہ ہمارے ذاتی تعلقات یا خان بہادر سید عین الدین صاحب  
 کے اثر کے ماتحت لیکن انجمن تعلقہ داران اودھ کی طرف سے کوئی دست امداد  
 دراز نہیں ہوا۔ اخبار کا خیر مقدم تو خیر سب ہی نے کیا۔ بڑی بڑی امیدیں دلائیں  
 اور بڑی بڑی توقعات قائم کیں مگر تجوری کسی نے بھی نہ کھولی۔

## ہاتھی باندھ لیا

روزنامہ اخبار کے مصارف اور ہمارا ایسا فاقہ مست محض خریداروں کا  
 چندہ ایک روز نامہ کو چلانے کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے سرمایہ دار ایک  
 روزانہ اخبار کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ ہمت اور استقلال کا جہاں تک سوال  
 ہے اس کی ہم میں کمی نہ تھی۔ تلخی خدمت کے علاوہ دوڑ دھوپ بھی کافی کر سکتے  
 تھے۔ مگر قسمت کی خوبی ملاحظہ ہو کہ خان بہادر سید عین الدین صاحب بھی  
 ریٹائر ہو گئے۔ اور یہ ہاتھی ہمارے دروازے پر بندھا ہوا چھوڑ گئے۔ کچھ دنوں

تک تو ہم اس ہاتھی کے لئے چارہ فراہم کرتے رہے۔ آج خان بہادر سید احمد حسین صاحب رنجوی نے ایک عطیہ دے دیا۔ تو کل نواب صاحب چھتاری سے کچھ حاصل کر لیا۔ تعلقہ دار صاحبان کو متوجہ کیا کہ آپ اس کو اپنا پرچہ کہتے ہیں تو اس کو سنبھالئے۔ مگر وہ ٹھہرے رئیس، ان کو بجلا اس کی کیا فکر کہ ان کی غفلت کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ آخر کار ان کی طرف سے مایوس ہو کر پہلے نو گھر کا جو بچا کھچا تھا، وہ سب اخبار کی نذر کر دیا۔ اس کے بعد ربر اور محترم ڈاکٹر محمد عمر صاحب سے کچھ روپیہ قرض لیا اور وہ اپنی ایک کتاب کا حق تصنیف حاصل کر کے ادا کیا۔ اپنی منہ بولی خالہ اماں بیگم صاحبہ خان بہادر شیخ احمد علی صاحب سے کچھ قرض لیا اور سب کچھ اخبار میں لگا کر اس طوفان کی نذر کر دیا۔

## طوفان گذر گیا

”طوفان“ طوفان بن کر آیا۔ اور طوفان بن کر ہم کو بھی اپنے ساتھ بہا لے گیا اور اب ہم پھر گھر کے رئیس تھے۔ وہ تو کہئے کہ عین اسی زمانہ میں آل انڈیا ریڈیو نے اپنا لکھنؤ اسٹیشن کھول دیا۔ اور ہم کو ریڈیو سے کافی آمدنی ہونے لگی تھی۔ تقریریں، ڈرامے، اسکیچ سب ہی کچھ تو لکھ رہے تھے۔ پھر ایک موقع یہ بھی مل گیا کہ ہماری دو کتابیں ایک ہندی کے پبلشر نے ہندی میں پیش کرنے کے لئے ہم کو معقول معاوضہ دے دیا اور یہ روپیہ ہم نے بیگم کے حوالہ کر دیا۔ کہ آپ سعید اور غور شید کی ختنہ دھوم سے کرانا چاہتی ہیں۔ تو اپنی اس دھوم دھام کو اسی روپیہ کی حدود میں رکھئے گا مگر روپیہ صرف ہوا دوسری صورت سے :-

## خورشید کو دفتھیر یا

اس وقت چھوٹے اور آج کے سچلے صاحبزادے خورشید عمر کو یکایک انجان ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹپک ٹپک پرست بڑھ گیا۔ اس نے ایک دن شکایت کی کہ میرے حلق میں درد ہے۔ اور ہم نے یوں ہی دیکھنے کے لئے زبان پر چھپ رکھ کر حلق جو دیکھا تو خفیف سا ایک سفید رنگ کا دانہ سا معلوم ہوا۔ دل نے فوراً کہا کہ یہ ڈفتھیر یا تو نہیں ہے۔ دڑے ہوئے گئے اور ڈاکٹر کو بلا لائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اختلاف کیا۔ مگر ہم مطمئن نہ ہو سکے۔ اور ایک دوسرے ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا۔ ان صاحبانے کچھ خفیف سا شبہ ظاہر کرتے ہوئے حلق کے لعاب کا کیمیاوی امتحان کرنے کا مشورہ دیا۔ اس تمام کارروائی میں شام ہو گئی۔ مگر امتحان کا نتیجہ وہی نکلا کہ ڈفتھیر یا ہے۔ ڈاکٹر نے ایک انجکشن تو خود دیا اور ہم کو مشورہ دیا کہ اسی وقت بچے کو میڈیکل کالج لے جاؤ۔ ڈفتھیر یا کی تصدیق نے جان تو زکال ہی لی تھی مگر جو اس قائم تھے۔ ہم نے فوراً ایک فیکسی پر بچے کو میڈیکل کالج پہنچایا اور وہاں اسی وقت داخلہ ہو گیا۔ اور دوسرا انجکشن دے دیا گیا۔ اب میڈیکل کالج میں ہم تھے۔ اور یہ بچہ۔ لاکھ لاکھ لاکھ سب نے کہا کہ ہم اس کے ساتھ رہ جائیں گے مگر ہم نے یہ خطہ کسی اور کو دینا مناسب نہ سمجھا بلکہ متوری امراض کے اس وارڈ میں جہاں ہر طرف ڈفتھیر یا کے مریض تھے بچے کو لے کر خود ہی اسپتال میں رہے پہلی رات تو پلک تنگ نہ جھپکائی۔ اس لئے کہ خورشید خطرہ سے باہر نہ تھا دوسرے ہر طرف

مریضوں کے کر لہنے کی آوازیں موت کی خبریں، جانکنی کی اطلاعات آرہی تھیں اور ایک عجیب و وحشت خود ہم پر طاری تھی۔ چاہتے یہ تھے کہ خورشید آرام سے سو جائے ہم خواہ سوئیں یا نہ سوئیں۔ ڈفتمیر یا کے دوسرے مریض بچوں کو دیکھ دیکھ کر جو اس گم تھے کسی کی گردن کی رگیں گئی ہوئی تھیں۔ اور کبوتروں کے پردوں سے ان کو صاف کیا جاتا تھا کسی بچے کو لوگ اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ اب یہ آخری سانس لیتا ہے۔ اور کسی کے متعلق یہ شبہ تھا کہ یہ سانس لیتا ہی ہے یا نہیں اسی وحشتناک ماحول میں گھبرا گھبرا کر نہ معلوم کس طرح صبح کی۔ صبح ڈاکٹر نے خورشید کو دیکھ کر ہم سے کہا کہ آپ نے تو بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں کو مات کر دیا۔ اور ڈفتمیر یا کو اس وقت پہچان لیا جب اس کی طرف خیال ہی مشکل سے منتقل ہوتا ہے ہم خود حیران تھے کہ یکایک ڈفتمیر یا کا خیال کیونکر آگیا۔ کسی اور مرض کا خیال کیوں نہ ہوا، مگر یہ بھی دراصل تائید غیبی تھی۔ اور خداوند کریم کو منظور تھا کہ بچہ بچ جائے۔ لہذا ہم ساری آنکھیں اس طرح کھول دی گئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم کو یقین دلایا کہ اب بظاہر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ ذلت پر روک تھام ہو گئی ہے مرض آگے نہیں بڑھا ہے یہی سب سے بڑی بات ہے۔ ورنہ یہ مرض دیکھتے ہی دیکھتے اور ذرا سی غفلت میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ ہم تو خیر خورشید کے پاس تھے۔ مگر سعیدہ کا برا حال تقادہ گھر پر پریشان تھیں۔ میڈیکل کالج کے قریب کی وجہ سے سعیدہ معہ اپنے تمام متعلقین کے زر کوٹھی میں آگئی تھیں۔ اور روز شام کو دیکھنے آیا کرتی تھیں۔ آجکل ان کو بچے سے زیادہ ہمارے حال ترس آتا تھا کہ ہم اس طرح بچے کے ساتھ اسپتال میں پڑے ہیں۔ رات کو زمین پر ذرا کمر سیدھی کر لیتے ہیں۔ دن رات بچے کی

ناز برداری کرتے ہیں۔ اور تمام خلاف معمول مشقت کا اثر ہماری صحت پر پڑ رہا تھا۔ مگر خیریت یہ ہوئی کہ خورشید میاں جلد جلد سنبھلنے لگے اور ہم کو زمین ہی پر سہی نیند آنے لگی۔ آخر آٹھ روز کے بعد ان کے حلق کے عاب کا پھر معائنہ ہوا اور یہ طے ہو گیا کہ مرض کا اب کوئی اثر نہیں ہے۔ لہذا ہم ان کو نجیب ریت تمام اسپتال سے لے کر گھر آگئے۔ اس سلسلہ میں وہ تمام بروپیہ جو ان کی تقریب کے لئے رکھا گیا تھا۔ ان کی زندگی حاصل کرنے پر صرف ہو گیا۔ اور ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اگر ان ہی دامنوں پر حضرت ہم کو واپس مل گئے تو ہم گویا سستے چھوٹے در نہ اعمال تو ایسے نہ تھے کہ خدا اتنا بڑا فضل ہم کرتا۔

## ختہ اور اس کی تقریب

عورتوں کے واسطے تو خیر ہزاروں مصیبتیں ہیں اور اگر وہ ذرا مصیبت پر کمر باندھ لیں تو ہر سال موت اور زندگی کے امتحان میں پڑ سکتی ہیں، مگر مردوں کے لئے بھی ختنہ ایک امتحان سے کم نہیں ہے۔ سعید اور خورشید کافی بڑے ہو گئے تھے۔ اول تو ہم کو اپنی غلطی کا افسوس تھا کہ جس وقت یہ حضرت نہا پچھے پر تھے اسی وقت اس مرحلہ سے فرصت کیوں نہ کر لی، عقیقہ اور ختنہ اگر ساتھ ہی جاتا تو آج یہ فکر نہ ہوتی۔ اور اب زیادہ دیر کرنا اس لئے مناسب نہ تھا کہ فی الحال تو خیر وہ سمجھدار ہوئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری اس غفلت کی بدولت بغیر ختنہ کے بالغ ہو جائیں آخر میگم صاحبہ کے مسلسل تقاضوں سے مجبور ہو کر پہلے تو چپ چپاتے ختنہ کرادیا اور پھر جب وہ صاحب یاب ہو گئے تو ایک معمولی سی تقریب کر کے ان کا غسل صحت کر دیا

حالانکہ غلتنہ اور غسلِ صحت کے درمیان بیچاروں پر عجیب عجیب مصیبتیں گزریں  
 مارے احتیاط کے ہم نے ڈاکٹر کو بھی غلتنہ کے وقت بلا لیا تھا۔ اور نالی نے جیسے  
 ہی چھٹی پالی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی پٹی چڑھا دی تھی۔ مگر کچھ ہی دن کے بعد  
 رخم کے ارد گرد زہریلے چھلے پیدا ہو گئے۔ اب نالی نے کہا کہ یہ ڈاکٹر صاحب  
 کی کرامت ہے۔ اور ڈاکٹر نے کہا کہ یہ نالی کے استرے کا زہر ہے۔ مختصر یہ  
 کہ بچے بچانے سا جھگڑا ہانڈی بن کر رہ گئے تھے۔ شکر ہے کہ ہانڈی ٹوٹتے  
 سے پہلے۔ اور غلتنہ دکھانے غسریوں نے اٹھایا تھا۔ اس کا تھوڑا بہت بدل  
 ان کو غسلِ صحت کے موقع پر مل گیا۔ جب وہ درلہا بن کر محفل میں آئے اور گھر  
 میں مہمانوں کی چہل پھل دیکھی۔

## آغا کا روپیہ

میں اس سے پہلے "تاش اور بانیاں" کے زیر عنوان یہ کہہ چکا ہوں کہ تاشوں  
 کے شوقیہ کے پیچھے ایک مرتبہ پوری تنخواہ ہار گیا تھا۔ اور نسیم صاحب سے کہہ کر ایک  
 آغا سے روپیہ تسر من لیا تھا۔ اس روپیہ کا سود ہر مہینے ادا ہوتا رہا مگر اصل ادا کرنے  
 کی نوبت کبھی نہ آ سکی۔ وجہ یہ تھی کہ آمدنی سب بیسگم کے ہاتھ میں جاتی تھی اور چند  
 روپے بہانے بانیاں گھر کے اور بیسگم کو بیلا بچھلا کر ان سے ہم لے لیتے تھے۔ جو آغا  
 کے روپے کا سود دیا کرتے تھے۔ یہ سود ہم آغا کو نہیں بلکہ نسیم کو دے دیتے تھے کہ  
 تم بے دینا۔ ایک دن اتفاق سے وہ پر دو ٹوٹا ہم نے بیسگم صاحب سے  
 قبضہ میں دیکھا اور جان ہی تو نکال گئی۔ کہ یہ ان کے پاس کہاں سے آیا اور ان

کو کیسے خیر ہو گئی۔ بیگم نے اس راز کے کھل جانے کے بعد ہماری بری طرح خبر لی اور اس قدر شرمندہ کیا کہ اگر خدا نخواستہ غیرت دار ہوتے تو پھر ان کو سنہ نہ دکھاتے۔ آخر ان سے معلوم ہوا کہ وہ بہت دنوں سے آغا کی قائم مقامی کر رہی ہیں۔ نسیم صاحبہ نے مائے دوستی کے ان سے کہہ دیا کہ شوکت صاحب نے اتنا عرصہ ہوا اس قدر رقم ایک آغا سے قرض لی تھی۔ اور سود کے طور پر اس سے دو گنی رقم ادا کر چکے ہیں۔ مگر اس روپیہ کا انتظام کر دیا جائے تو سود کا یہ سلسلہ ختم ہو۔ بیگم نے روپیہ دے کر پر دوٹوٹ لے لیا۔ اور نسیم صاحبہ سے کہا آپ شوکت صاحب سے ہر ماہ سود لیتے رہتے۔ اور مجھ کو دیتے رہتے چنانچہ وہ سود کی رقم معلوم نہیں کتنے دنوں سے ان کے پاس جاز ہی تھی۔ اور اس طرح غالباً وہ بھی اتنا روپیہ وصول کر چکی تھیں جس قدر پر دوٹوٹ حاصل کرنے پر آغا کو ادا کرنا تھا۔ مگر اس سلسلے میں جو شرمندگی ہم کو اٹھانا پڑی ہے۔ اس کو ہم عمر بھر نہیں بھول سکتے۔ واقعی ایک آغا سے قرض لینا بہت جھوٹی شے بات تھی۔ اور اس سے بھی جھوٹی بات یہ کہ تاش کھیلنے کے سلسلے میں یہ حرکت کرنا پڑی تھی۔ اس واقعہ کو یاد کر کے خود اپنے سے نفرت ہو جایا کرتی ہے۔

## چوری

اب کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ مائے صفائی اور سچائی کے ہم اپنی کسی چوری کا حال بھی لکھنے بیٹھ گئے ہیں۔ جی یہ چوری ہم نے نہیں کی تھی بلکہ ہمارے یہاں ہوئی تھی اس زمانہ میں ہمارے یہاں ایک ملازم تھا۔ اور ایک تھی اس کے ساتھ عورتیں کو وہ اپنی بیوی کہتا تھا اور ہم کو یقین تھا کہ یہ اس کی داشتہ ہے ان ملازم صاحبہ

کے عشق کا یہ عالم تھا کہ اس عورت کو دیوی کی طرح پوجتے تھے۔ اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کیا کریں کیا پائیں اور اسے دے کر اس کی صرف ایک مسکراہٹ حاصل کر لیں، جب دیکھتے مٹھائیاں لارہے ہیں اچھے اچھے کپڑے خرید رہے ہیں۔ ان کے بناؤ سنگانہ میں مصروف ہیں۔ مگر اس کے ساتھ کام میں کوتاہی نہ کرتا تھا۔ اور ایمان داری کا سکہ بھی ایسا بٹھا دیا تھا کہ ہم سب اس پر گھر چھوڑ کر شہر کے باہر تک چلے جاتے تھے ہفتوں وہ تنہا گھر رہتا تھا۔ اور بیوی یا داشتہ سے دل پہلا یا کرتا تھا، ہم لوگ پہاڑ چبائے ہیں اور وہ گھر کے محافظ ہیں مگر ایک دن ایک مختصر سے سفر سے واپس آکر دیکھا کہ ملازم صاحب معہ اپنی رلنواز کے غائب، فوراً گھر کی تمام چیزوں کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ کچھ نقد روپیہ، کچھ زیور جو ان کے ہاتھ لگ سکا۔ لے کر غائب ہوئے ہیں یعنی اچھا خاصا ہاتھ صاف کر گئے ہیں۔ پولیس میں رپورٹ کھوائی۔ مگر پولیس کی طرف سے تو یہ مطالبہ ہوا کرتا ہے کہ بتا دو وہ کہاں ہے پھر ہم پکڑ لیں گے۔ ان حضرات کا کبھی پتہ نہ چلا اور زیور پر زکوٰۃ نہ لگانے کا یہ پھیل ہم کو مل گیا۔ کہ ہمیشہ سب کی ادائیگی ہو گئی۔

## پرائیویٹ سیکریٹری

طوفان کے بند ہو جانے کے بعد سے ہم بیکار تو تھے ہی ایک صاحب نے ہم کو ایک راجہ صاحب کا یہ پیغام دیا کہ اگر تم چاہو تو میرے یہاں پرائیویٹ سیکریٹری کی جگہ حسالی ہے۔ چلے آؤ۔ راجہ صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری! بات تو کچھ ادنیٰ سی معلوم ہوئی بن سنور کر حاضر ہو گئے اور اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ راجہ



صاحب نے ہمارا ہمتا ہرہ بکشد پنجاہ روپیہ ہوا تو تقرر کر دیا۔ اور ضروری ہدایات دیدیں  
 راجہ صاحب کے حرم سرا میں تشریف لے جاتے ہی لوگوں نے تعزیت کے لئے ہمارے پاس  
 آنا شروع کر دیا کہ سنا ہے کہ آپ پرائیویٹ سکریٹری ہوئے ہیں۔ اب صبح ہی آپ  
 سے سرمائش ہوگی کہ دس ہزار روپیہ قرض کا فوراً انتظام کرو، اگر آپ  
 نے انتظام کر دیا تو خیر ورنہ کل ہی قدر دعا فیت معلوم ہو جائے گی :-

ہم دل ہی دل میں سنتے کہ یہ لوگ ہم کو بھڑکار رہے ہیں۔ اتنا بڑا۔ راجہ بھلا یہ  
 حرکت کرے گا۔ اس قسم کے لوگ ایسے درباروں میں ہمیشہ ہوتے ہیں۔ جو خود اپنے  
 بنائے کرتے ہیں اور نئے آنے والوں کے قدم کسی طرح جمنے نہ دیں۔ تاکہ ان کی لوٹ  
 مار میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ راجہ صاحب کی ریاست کافی بڑی تھی حکومت  
 میں ایک خاص ائندار آپ کو حاصل تھا۔ خطاب یافتہ تھے اور یہ مسخرے ہم کو سمجھا  
 رہے تھے کہ راجہ صاحب صبح ہوتے ہی ہم سے قرض کی سرمائش کریں گے ہم  
 ان ہی باتوں پر غور کر رہے تھے کہ راجہ صاحب کے پرانے پرائیویٹ سکریٹری صاحب  
 تشریف لے آئے جن کے متعلق جب بار بار ہم کو یقین دلایا گیا کہ آپ واقعی پرائیویٹ  
 سکریٹری تھے۔ اور آپ ہی کی جگہ پر ہم بلائے گئے ہیں۔ تو ہم کو یقین آسکا۔ ورنہ  
 آپ کسی طرح بھی پرائیویٹ سکریٹری ہو کر ہمارے لکھے آدمی ہی نظر نہ آتے تھے آپ صاحب  
 صاحب کے منتظر تھے۔ اور یہ انتظار کے لمحات آپ نے ہمارے پاس بیٹھ کر  
 گزارے۔ اس عرصہ میں معلوم یہ ہوا کہ آپ اپنی بقیہ تنخواہ حاصل کرنے  
 آئے ہوئے ہیں۔ جو سنا تھا کہ جب الوداع ہے۔ ہم ایک دم اچھیل پڑے  
 اور ان سے پچھرا اس مدت کی تسدیق چاہی تو معلوم ہوا کہ آپ نے اس جگہ پر

آٹھ مہینے کام کیا ہے جس میں صرف ایک مہینے کی تنخواہ چار قسطوں میں ملی تھی۔  
 باقی سات ماہ کی واجب الادا ہے۔ اور اسی کے مطالبہ پر ان کو علیحدہ کیا گیا ہے۔  
 اب تو ہمارے ہوش اڑنے کے لئے پر توڑنے لگے کہ اتنے میں راجہ صاحب بھلا در  
 تشریف لے آئے۔ اور ہمارے پاس ان حضرت کو بیٹھا ہوا دیکھ کر فرمایا  
 شوکت صاحب ان سے حساب بنوایئے اور کہہ دیجئے کہ اگلے مہینے کی  
 پہلی تاریخ کو آئیں۔ ان حضرت نے آگے بڑھ کر کہا۔ حضور اس عرصہ میں  
 قانون مرجاؤں گا۔

راجہ صاحب نے فرمایا۔ اچھا ان کو دس روپے دیدیجئے۔  
 ان حضرت نے پھر دست بستہ عرض کیا۔ سرکار دس روپے میں بھلا کیا  
 کام ہو سکے گا۔

راجہ صاحب نے ہم کو بلا کر کان میں کہا۔ پہلے پندرہ روپے پھر نہ مانے تو میں نے  
 کہ ٹال دو۔ بڑا کمبخت ہے یہ۔

ہم نے تعمیل حکم میں ان صاحب کو بیس روپے دے کر رسید لی۔ مگر اب  
 سوال یہ تھا کہ خود ہمارا کیا حشر ہوگا۔ اگر ہمارے ساتھ بھی راجہ صاحب نے یہی سلوک  
 فرمایا۔ تو ہم تو گویا کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔ ہم اسی شش و پنج میں تھے کہ ایک بڑا  
 نے آکر سلام کیا۔ اور نہایت عاجزی سے کہا کہ اگر اس کے بل کا نصف بھی  
 ادا کرادیں تو وہ ہم کو ایک ٹھنڈے سوٹ کا سوئی کپڑا اسی وقت دے  
 گا۔ اور کل بل ادا کرادیں تو ریشمی سوٹ بنوادے گا۔ ہم نے یہ تمام باتیں جا کر  
 راجہ صاحب سے کہہ دیں کہ وہ ہم کو اس شرط پر سوئی سوٹ دے رہا ہے اور

اس شرط پر ریشمی سوٹ، اب فرمائیے سوٹی سوٹ لوں یا ریشمی سوٹ راہ صاحب نے اس کا حساب پیش کرنے کا حکم دیا۔ یہ حساب کچھ ہزاروں کا نہیں بلکہ پانچ چھ سو روپے کے لگ بھگ ہوگا۔ راہ صاحب نے سرسری طور پر حساب دیکھ کر کہا، ”ٹھیک ہے یہ ڈکیتی کرتا ہے اسے بچا اس روپے کا ایک چک دے کر رخصت کرو۔“

ہم نے تعمیل حکم میں بزاز سے کہا کہ بچا اس روپے کی ادائیگی کا حکم ہوا ہے بزاز نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور آخر راہ صاحب نے بلا کر اس کو اس قدر ڈانٹا ہے کہ توبہ بھلی مگر وہ برابر دعائیں دیتا رہا۔ اور آخر دو سو روپے کا چک لیکر وہاں سے ٹلا اور ہم کو اس نے اس سلسلہ میں پانچ روپے دینا چاہے مگر ہم نے انکار کر دیا جس پر اسے سخت حیرت ہوئی اس نے کہہ پرانے سکریٹری صاحب تو پانچ آنے بھی بقول اس کے نہ چھوڑتے تھے۔ بزاز کے چلے جانے کے بعد ہم نے پھر اپنے متعلق غور کرنا شروع کر دیا۔ ہم کس طرح بھاگیں یہاں سے۔ تمام حالات کا اندازہ کرنے کے بعد ہم یہ سمجھ چکے تھے کہ یہاں تنخواہ تو خیر کسی کو نہیں ملتی۔ مگر یہ لوگ دور رسا طرح لوٹ مار کر کے اپنا پیٹ پالتے رہتے ہیں۔ اور کسی کو تنخواہ کی زیادہ فکر بھی نہیں ہوتی۔ مگر یہ بات ہمارے بس کی نہ تھی۔ آخر ہم نے راہ صاحب کو ایک خط لکھا جس میں صفائی کے ساتھ تمام باتیں لکھ دیں۔ کہ یہاں کا اندازہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں اور یہ ملازمت ان حالات کے تحت میرے لئے ناممکن ہے لہذا مجھے اجازت دی جائے کہ میں رخصت ہو جاؤں۔ راہ صاحب نے اس خط کو دیکھتے ہی ہم کو طلب کیا اور ہم نے ان کے سامنے بھی تمام حالات پیش کر کے موزور کیا

ظاہر کردی اور صاف صاف کہہ دیا کہ میں دراصل اس قسم کی ملازمت کے  
 منصب کا آدمی ہی نہیں۔ راجہ صاحب نے بجائے ہم کو مطمئن کرنے کے اور بھی  
 اندیشہ میں مبتلا کر دیا۔ کہ صاحب یہ تو رہا ستوں کی ملازمت ہے تنخواہ محض ایک  
 ہمانہ ہوتی ہے۔ در نہ پرورش تو دوسری صورتوں سے ہوا کرتی ہے۔ مجھے سب  
 کچھ معلوم ہوتا رہتا ہے۔ گر میں چشم پوشی سے کام لیتا رہتا ہوں بہر حال اگر آپ  
 اس قدر بدول میں تو میں آپ کو مجبور نہیں کرتا۔ ہم بخیریت تمام اپنا اس ملازمت  
 کے پہلے ہی دن واپس آ گئے۔ اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے پہلے ہی دن  
 ہماری آنکھیں کھول دیں۔ در نہ نہیں معلوم کیا حشر ہوتا۔ اگر خواستہ ہم کو پرانے  
 سکرٹری صاحب کی طرح بننا پڑا تو اس زندگی سے ہم موت کو ہزار درجہ بہتر سمجھتے  
 وہ حضرت تو کسی کا بچی پاؤس کے منشی کے علاوہ اور کچھ نظری نہ آتے تھے

## لکھنؤ ریڈیو

اس بے کاری کے زمانہ میں ریڈیو کی وجہ سے نہایت باکار رہنا پڑتا تھا  
 براہِ رسم ملک حبیب احمد صاحب ڈائریکٹر آف پروگرام تھے۔ ان کا بس چلتا تو  
 وہ ہم سے گانا بھی گواتے، وہ تو یہ کہتے کہ خیریت یہ گزری کہ ہم موسیقی کے  
 سلسلہ میں نہایت جاہل نکلے۔ گانا تو درکنار راگوں کے نام سے بھی واقفیت نہ  
 تھی۔ البتہ ڈراموں کا محکمہ اور تقریروں کا صیغہ ہماری تحریروں سے چند ہی دن  
 میں پاٹ دیا گیا۔ تقریروں کا پہلا سلسلہ سمرقند و بخارا تھا جس میں تمام تقریریں  
 ہم نے کیں۔ یہ تقریریں مزاحیہ تھیں اور دنیا کے اس دور کے متعلق تھیں جب

انسان راکٹ کے ذریعے مریخ پر بھی طرح جایا کرے گا جس طرح آج کل ہوائی جہاز کے ذریعے ہندوستان سے لندن جایا کرتا ہے۔ اور مریخ کے باشندوں سے اس طرح ربط مضبوط پیدا ہوگا جس طرح آج کل دنیا کے ایک ملک کے باشندے دوسرے ملک کے باشندوں سے ربط مضبوط پیدا کرتے ہیں۔ یہ تقریریں گویا سیاحتِ مریخ کی ڈائری کی صورت میں تھیں۔ اس سلسلہ کے علاوہ سب سے پہلا ڈرامہ لکھنؤ ریڈیو کے لئے ہم نے لکھا، اس کا نام،، خدا حافظ،، تھا۔ اس ڈرامہ میں خود ہی ہیروز کا پارٹ بھی کیا تھا۔ اور اس کے بعد تو اس قدر ڈرامے لکھے ہیں کہ اتنی گنتی آتی ہوئی تو اس وقت ریاضی کے بہت بڑے ماہر ہوتے۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن نے ہم سے ڈراموں کا ایک سلسلہ مومن ٹائین ٹیبلر کی کمپنی آف کامیڈی گورام کے نام سے نکھوایا۔ یہ ڈراموں کا سلسلہ گویا اسٹیج ڈراموں پر ایک طنز تھا۔ کہ اسٹیج ڈراموں میں کس طرح قافیہ پیمائی ہوتی ہے۔ مثلاً اسی اسی سلسلہ کا ایک مکالمہ یاد آ رہا ہے :-

”وزیراعظم اس کو چھوڑ دو، اس کا منہ دربار کی طرف موڑ دو دیر پہلے

حکم کو میرے دوسرے حکم کے پیچھے سے توڑ دو“

جی چاہتا ہے کہ اس سلسلہ میں اسٹیج کے اس طنز کا تھوڑا سا خونہ پیا

بھی پیش کر دیا جائے۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی ایک تماشائے نام ملاحظہ ہو۔  
”دمشق کی بیٹی،، عرف ”زہر شبنم“، اسی ڈرامہ کا ایک حصہ ملاحظہ ہو۔

ایک سہیلی      لو اور سنو۔ شہزادی گلنار اور غم  
دوسری      اے نوج و دربار۔ شہزادی کے دشمنوں کو الم

- پہلی بھولی بھالی ہیں خوشی کو بھی غم کہتی ہیں۔  
 دوسری گل کی خوشبو کو بھی یہ ناک میں دم کہتی ہیں۔  
 گلشنار تم کو نہیں معلوم ہے۔
- ایک سہیلی آنکھوں پر کی فکر مجھے اب عذاب ہے، جنجال والدین کو میرا شبا بے  
 دوسری شاہزادی کا شباب اور والدین کو جنجال ہے  
 عجیب و غریب خیال ہے  
 شاہزادی تمہارا سمجھنا محال ہے۔ ہر وقت ان کو میری فکر شادی ہے سمجھ لو کہ ختم  
 میری آزادی ہے۔
- ایک سہیلی آہا ہا ہا ..... شادی  
 دوسری مبارک، مبارک ذکر خانہ آبادی  
 پہلی اس خوشی میں آؤ گائیں۔  
 دوسری دونوں ایک دوسرے سے آواز ملائیں۔  
 گلشنار کیوں مجھ دل حلی کو جلاتی ہو۔
- پہلی تم بھی تو باتیں بناتی ہو۔ دل کی خوشی کو ہم سے چھپاتی ہو  
 دوسری شادی ہونے والی ہے نا اتراتی ہیں۔ اور اس قدر خوش ہیں کہ  
 خوشی کو غم بتاتی ہیں۔
- پہلی جیسے ہم ان کا دلہا چھین ہی تو لیں گے۔  
 دوسری جی ہاں، جیسے ہم سن پائے تو رو دیں گے۔  
 شاہزادی نہیں رونا تو میری قسمت میں لکھا ہے۔ آہ تم کو نہیں معلوم کہ

جس پتھر سے میری قسمت پھوڑی جا رہی ہے۔ وہ سہرا اب ہے  
اب تم بھی کہو گی میری قسمت خراب ہے۔

اے تو سہرا اب میں کون سی برائی ہے۔

وہ سپہ سالار ہے کیا کوئی دھولی ہے، بہشتی ہے نائی ہے؟

وہ بھی تمہاری طرح ہے۔ مورت شباب کی

پسلی پھر ٹکی انگلی نظر انتخاب کی

میرے رکھے ہوئے دل کو نہ دکھاؤ۔ دیکھو میں رو دوں گی مجھ کو دستاؤ

اچھا تو تمہارے سامنے سہرا اب کی باتیں کریں۔

نہیں نہیں تم خود ان کا ذکر کرو۔ ہم سرد آہیں بھریں

آہ تم کو نہیں معلوم کہ یہ شادی میری موت کا پیغام ہے اور

سہرا اب میری موت کا دوسرا نام ہے۔

شادی کا ذکر اور یہ بد فال

دور پار دشمن کا یہ حال

آؤ ان کا دل پہلا میں

چھوڑو، اس ذکر کو آؤ گانا گائیں

گانا

تیرے گلشن میں کیسی بہا رہے

گل تو گل ہے۔ کلی پر نکھار ہے

تیرے گلشن میں کیسی بہا رہے

پہلی

دوسری

پہلی

دوسری

شاہزادی

پہلی

دوسری

شاہزادی

ایک پہلی

دوسری

پہلی

دوسری

یہ فضا مست مست

یہ ہوا مست مست

بخدا مست مست

ہر ادا مست مست

تو ہے مست اور سب کو خمار ہے  
تیرے گلشن میں کیسی بہار ہے

جیسے جام شراب

کیسا رنگین گلاب

آپ اپنا جواب

جیسے مست شباب

تیرے رخ پر گردہ نشا ہے  
تیرے گلشن میں کیسی بہار ہے

[ شہزادی گاتی ہے ]

یہ ہوا کب کا راس

میرا دل ہے اداس

ہر طرف جیسے یاس

نہیں جینے کی آس

گل کا ہنسنا بھی اب ناگوار ہے  
میرے گلشن میں کیسی بہار ہے

[ گانا ختم ہوتے ہی ایک پہلی چنتی ہے ]

ادنیٰ یہ کون ہے اس باغ میں

ایک پہلی

لو کثیرا ریگا اس کے دماغ میں

دوسری

نہیں وہ دیکھو جھاڑی میں ایک سفید پوش

پہلی

غالباً خرگوش

دوسری

نہیں نہیں کوئی انسان ہے

شہزادی



گر یہاں کیوں آیا سخت نادان ہے  
انسان کی شکل کا کوئی حیوان ہے۔

دوسری  
پہلی سہیلی  
اجنبی  
شاہزادی

(اپنی جگہ پر) آہ! یہ حسن یہ جوانی میری چلتی پھرتی مرگ ناگہانی  
(چپکے سے) الہی یہ انسان ہے یا حسن کا نرشتہ زور سے (چیلی تم جاؤ  
سو سن تم بھی اس سے پوچھ آؤ کہ کون ہے۔ اور کیا چاہتا ہے  
(اپنی جگہ پر) یہ کون ہے مس پارہ، میرے دل کی لگی ہوئی آگ کا  
ازگارہ۔ یہ عورت ہے یا آسمان کا تارہ؟

اجنبی

(قریب جا کر) اے شخص تیرا یہاں کیا کام ہے؟  
تو کون ہے تیرا کیا نام ہے۔

ایک سہیلی  
دوسری  
اجنبی

میں مجنوں ہوں، مجھے پیلے کا سب دیوانہ کہتے ہیں  
زمانہ بھر کے اہل دل مرا فسانہ کہتے ہیں

رہنس کر! آہا ہا ہا۔ آپ مجنوں ہیں

ایک سہیلی

تو اپنی پیلے کے پاس جاؤ یہاں کیوں آئے

دوسری

جہاں پر شمع جلتی ہے وہیں پروانہ آتا ہے

اجنبی

یہ دیرانہ نہیں ہے جس جگہ دیوانہ آتا ہے

ایک سہیلی

تو آپ عاشق زار ہیں

دوسری

گو یا اپنے دل کے چلتے پھرتے مزار ہیں۔

پہلی

معلوم ہوتا ہے کوئی دیوانہ ہے

دوسری

نہیں نہیں یہ بنا ہوا فرزانہ ہے

پہلی

دوسری شاہزادی تو پھر یہ چور ہے  
ر آ جاتی ہے) یہ کیسا شور ہے کیوں بے چارے کو تنگ  
کرتی ہو؟ ہٹ جاؤ۔

شاہزادی اہنبی [سہیلیاں چلی جاتی ہیں]  
اے شخص تو کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔

شاہزادی اہنبی صرف ایک نگاہ

شاہزادی اہنبی تیرا مطلب

شاہزادی اہنبی چاہ

شاہزادی اہنبی واہ واہ تمہارا کیا مشغلہ ہے  
کبھی آہ و نزاری، کبھی اشکباری کبھی دل زگاری کبھی بے قراری

شاہزادی اہنبی گر تم نے یہ نہیں بتایا تم کون ہو۔

شاہزادی اہنبی شاہ دمشق کا یکے از سپاہ

شاہزادی اہنبی گر میاں سپاہی تم کو الفت اور چاہ سے کام

شاہزادی اہنبی سپہ گری میرا پیشہ اور محبت میرا جنون خام

شاہزادی اہنبی سپاہی ہوتے ہوئے بھی تم چور ہو۔

شاہزادی اہنبی اور چوری کرنے کے بعد تم بھی بڑی دیدہ دلیر ہو

شاہزادی اہنبی میں نے چوری کی ؟

شاہزادی اہنبی بیشک ابھی اسی وقت

شاہزادی اہنبی وہ کیسے

اجنبی

یہ شمع سے پوچھو جو پردانہ کا دل چراتی ہے۔ یہ اس کلی سے پوچھو جو  
بلبل کو دیوانہ بناتی ہے۔ اور یہ لبی اس نظر سے پوچھو جو تمہارا  
دل چرانے کی جغلی کھاتی ہے۔

شہزادی

ایسی باتیں نہ کرو مجھ کو شرم آتی ہے

اس طنز میں قافیہ پیمائی کی زبردستیاں تو منہ رجبہ بالا اقتباس سے ظاہر ہو جائیں  
گی مگر اداکاری کی بوجھیاں ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ عورتوں کا پارٹ کس طرح مڑتے  
تھے۔ اور پارٹ کرنے والوں کو پرامیٹر کس طرح یاد دلاتا تھا۔ ایکٹر اس کے باوجود کس  
طرح بھولتے تھے وغیرہ یہ خاکہ ان ریڈیو ڈراموں میں پیش کیا تھا۔ اور یہ سلسلہ اس  
قدر مقبول ہوا کہ اس سے پہلے سلسلہ کے چھ ڈراموں کے بعد ہم گو دوسرا اور پھر تیسرا  
سلسلہ بھی لکھنا پڑا۔ ہمارا نام منشی جھومک لال ڈرامہ نگار تھا اور اس نمٹیل کے  
نامی گرامی ایکٹروں میں ملک حسیب احمد اور مسٹر غلام قادر مسٹر سراج و تھرا دریا  
لطیف الرحمن یہ سب ہی شامل تھے۔ اس سلسلے میں خود اسٹیشن ڈائریکٹر یعنی جنگل کشور  
صاحب مہرا ایسی گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ گویا آپ ہی "مالک مکنی ہذا" ہیں

## تنخواہ کی کیا ضرورت ہے

ریڈیو کے اس کام سے اس قدر آمدنی ہونے لگی کہ ہم نے خود بھی یہی سوچا کہ آخر  
تنخواہ کی کیا ضرورت ہے۔ اور دوسرے کی غلامی کرنے سے کیا فائدہ مگر ہم کو یہ نہ معلوم تھا  
کہ یہی روشنی طبع ہمارے لئے بلا بننے والی ہے۔ جتنا پتھر ریڈیو کے ارباب حل و عقد نے خالی  
دیر اندازہ کیا ہو گا کہ اس طرح تو یہ شخص بہت در پیہ گھسیٹ لے جائے گا۔ کیونکہ اس

کو خود ہی گھسیٹ لیا جائے۔ چنانچہ یکدن جنگل کشور صاحب مہرا نے ہم سے کہا کہ تم ریڈیو میں آخر باقاعدہ طور پر کیوں نہیں آ جاتے۔ ہم کو ان پر پورا اعتماد تھا۔ لہذا ہم نے صرف یہی جواب دے دیا کہ آخر آپ کو سمجھ سے کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے جہاں چاہے بھیج دیجئے۔ اور جو چاہے کیجئے۔

## ریڈیو کی ملازمت

اس گفتگو کے چند ہی دن بعد ایک روز جنگل صاحب غریب خانہ پر آئے اور ہم سے کہا چلو۔ ریڈیو اسٹیشن، یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ روزی وہ اس طرح گرفتار کر لیا کرتے تھے۔ اور ان کا موٹر اس کثرت سے ہمارے یہاں نظر آتا تھا کہ بچے تک اس موٹر کو ہمارا موٹر کہنے لگتے تھے۔ مگر آج جنگل صاحب نے کہایوں نہیں بلکہ باقاعدہ طور پر چلو ہم نے پوچھا خیریت؟ جواب ملا کہ ریڈیو میں ملازمت کا حکم آ گیا ہے اور تم آج سے اپنے کام کا چارہ چلے سکتے ہو۔ یوں ہر روز ریڈیو ہی میں وقت گزرا کرتا تھا۔ اور اب تو گویا پابندی تھی۔ جو تفریح تھی وہ روزی بن گئی۔ اخبار نویسی کی زندگی کو نہیں سے خیر باد کہا۔ اور زندگی کے اس نئے دور کی ابتدا گایا کر شروع کر دی۔

ختم شد